اسلام اور بیمہ

علامہ موسیٰ جار اللہ

کی

معرکۃ الآرا کتاب

تامین الحیاۃ والاموال والاملاک

کا ترجمہ

از

مطیع اللہ الافغانی

سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی
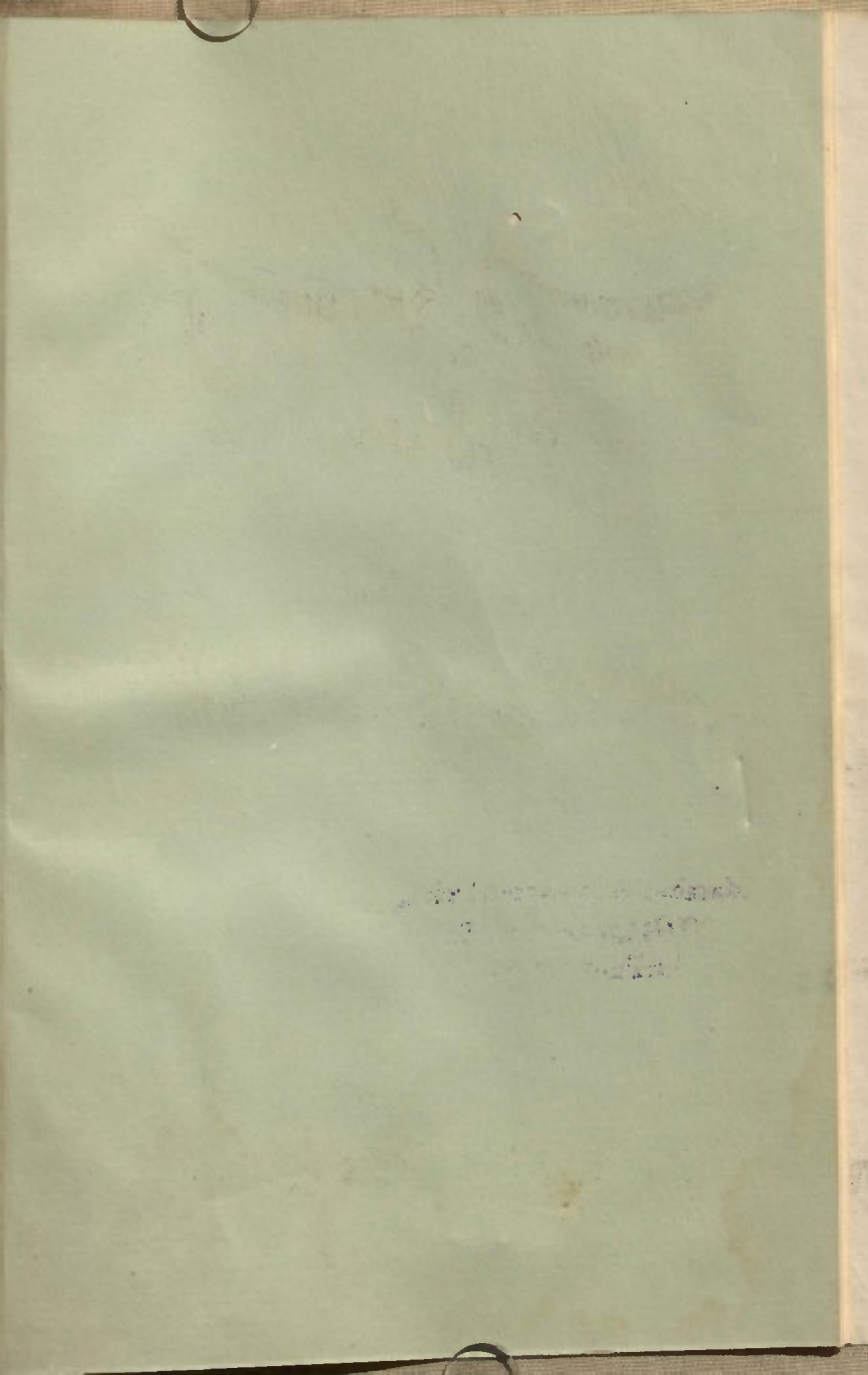
اسلام اور بیمہ

علامہ موسیٰ جاراللہ کی معرکتہ الآرا کتاب

تامین الحیاۃ والاموال والاملاک

کا ترجمہ

مترجم

مطیع اللہ الافغانی

لطیفی پبلشنگ ھاؤس، لطیفی پریس لمیٹڈ دھلی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"ربِّ انی لما انزلت الیّ من خیرٍ فقیرٌ"

حضرت علامہ موسیٰ جار اللہ صاحب کی اصل کتاب جس قیمتی مواد کی حامل ہے اس کی افادیت سے بالغ النظر شخص کو انکار نہیں ہو سکتا مزید براں فاضل مقدمہ نویس نے اس پر جو مدلل اور بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے وہ سونے پر سہاگا ہے، اس کے بعد بظاہر میرے کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن پھر بھی میرے دلی تاثرات مجبور کر رہے ہیں کہ میں بھی حضرات علمار کرام کی خدمت میں اپنی آرزو پیش کروں شاید ان کو مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی پر کچھ ترس آجائے اور وہ ہماری کشتی کو پار لگانے کے لئے حضرت علامہ موسیٰ جار اللہ صاحب کا بتایا ہوا راستہ یا کوئی دوسرا طریقہ ہم کو بتائیں! ۔

حضرت علامہ محترم نے مشرق اور مغرب کی سیاحت کے بعد اپنی یہ چھوٹی اور مدلل کتاب لکھ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے موصوف نے مختلف متمدن و غیر متمدن ممالک کی سیاحت کی ہے اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا بغور بڑی دلچسپی سے مطالعہ فرمایا ہے۔

دنیا میں مسلمان عوام کو تو جانے دیجئے ذرا ہمارے ان اسلامیہ ممالک کی اقتصادی حالت کو ملاحظہ فرمائے. جن کے وجود پر ہم کو فخر و ناز ہے، یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ہماری یہ حکومتیں بھی عام بدحال مسلمانوں کی طرح اپنے اقتصادی بحران کی وجہ سے غیر مسلم حکومتوں کی ہر معاملہ میں محتاج ہیں، نہ تو ان کے یہاں ضرورت کے مطابق صنعتی کارخانے ہیں اور نہ وہ اپنی ضرورت کی چیزوں کے سلسلہ میں غیر اسلامی حکومتوں سے بے نیاز ہیں جس طرح عام مسلمان ساہوکاروں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں اس طرح یہ ممالک بھی غیر اسلامی حکومتوں کے کروڑوں روپیہ کے مقروض ہیں۔

اس پر مزید تکلیف دہ چیز ہمارے مسلمان امرار، رؤسا، شہزادگان اور دولتمند طبقہ کا ناعاقبت اندیشانہ رویہ ہے، ہمارے سب سے بڑے

رئیس، اور سب سے بڑے سرمایہ داروں کے کروڑوں روپیہ یورپین
انگریزی، اور فرانسیسی بنکوں اور انشورنس کمپنیوں میں لگے ہوئے ہیں
چنانچہ مصر، ترکی، عرب، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے رؤسا
وغیرہ غیروں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں گویا بجائے اس کے کہ غریب اور
مفلس مسلمان طبقہ ان کی دولت سے ان ہی کے ملک میں فائدہ اٹھاتا،
یورپین کمپنیاں اور بنک مختلف طریقوں سے ان ہی کے سرمایہ سے تجارت
کرکے ان ہی کی رعایا اور ان ہی کے بھائیوں کو لوٹتی ہیں، یہ حالت ہمارے
لئے نہایت افسوسناک ہے، ایسے مسلمان نہ صرف ہماری عزت اور
احترام کے مستحق نہیں بلکہ ہمارے موجودہ افلاس اور غربت کی بنا پر ہماری ملامت
کے سزاوار بھی ہیں عوام کی اقتصادی بدحالی اور تنگ دستی اور ان کی دانستہ
لاپرواہی اور بے توجہی کو دیکھتے ہوئے ہم کو حق ہے کہ ان کی نام نہاد ہمدردی
کو شبہ کی نگاہ سے دیکھیں .. —— وہ یا تو یورپین کمپنیوں کے ذریعہ سے
قوم کو لوٹتے ہیں یا مسلمانوں کی ابتر اقتصادی حالت کا احساس کیے بغیر
اپنی عیش پرستی میں مشغول رہا کرتے ہیں، ان کے یہ دونوں فعل قوم کی موجودہ
حالت کے پیش نظر قابل مذمت ہیں، عام مسلمانوں کی تباہ حالی کی چند

مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں جو ہر دانشمند اور دُور اندیش مسلمان کی عبرت کے لئے بہت کافی ہیں :۔

(۱) گذشتہ چالیس سال کے عرصہ میں سندھ سے آسام تک مسلمانوں کی تین چوتھائی جائدادیں ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہیں سندھ کے نوّے فیصدی مسلمان مقروض ہیں :۔

پنجاب میں ہندؤں کا انکم ٹیکس مسلمانوں سے بیس گنا زیادہ ہے۔ ہندؤں کی آمدنی اور جائدادیں مسلمانوں سے بیس گنا زیادہ ہیں' اخبار ایمان ۸ جون ۳۷ء

(۲) کپتان ہملٹن لکھتا ہے کہ عبد الغفور باشندہ سورت کی جائداد ایسٹ انڈیا کمپنی کی متفقہ سرمایہ سے زیادہ تھی ۱۶۹۰ء میں ان کے ایک جہاز کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا جس میں نو لاکھ روپے کا مال تھا :۔

(۳) وقف ہگلی کے مشہور واقعہ کے متعلق سر ولیم ہنٹر لکھتا ہے کہ ۱۸۰۶ء میں ایک مسلمان رئیس نے مرتے وقت ایک بڑی جائداد وقف کی تھی، اس وقف کے دو متولیوں میں جھگڑا ہوا، دوران مقدمہ میں جائداد کی آمدنی سے ساڑھے دس لاکھ روپیہ جمع ہو گیا، اور ایک لاکھ بیس ہزار کی آمدنی اس کے علاوہ تھی :۔ رسالہ دین و دولت ص ۲۵، ۲۶۔ اس وقف

کا خدا جانے کیا حشر ہوا۔

(۴) گورنمنٹ آف انڈیا کی محکمہ اعداد و شمار کا ڈائرکٹر اور مشہور مورخ اپنی کتاب۔ "مسلمان ہندوستان میں" لکھتا ہے کہ ۱۸۰۰ء کے شروع میں بنگال کے کسی مسلمان کا غریب ہونا ناممکن تھا، دولت کے چشمے مسلمان گھرانوں کو ہمیشہ لبریز رکھتے تھے، اب مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے عورتوں اور لڑکیوں کو گرو رکھنے پر مجبور ہیں؛۔

(۵) ضلع ڈیرہ غازی خاں میں بلوچ لڑکیوں کی بیع و فروخت کے نفاذ میں ہر سال لاکھوں روپیہ کی ڈگریاں زیر دفعہ ۸ قانون سرحدی صادر کی جاتی ہیں انگریز ڈپٹی کمشنر فیصلہ کرتے وقت صاف طور سے لفظ Sold فروخت استعمال کرتا ہے؛۔

(۶) ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق پنجاب میں کل ۷۷۶ کارخانے تھے جن میں سے ۵۵۴ کے مالک ہندو اور صرف ۹۶ کے مالک مسلمان تھے، اخبار ایمان اقتصادی نمبر صـــ۳ پٹی لاہور۔

(۷) اخبار النجم لکھنؤ ۱۷ نومبر ۱۹۳۶ء لکھتا ہے، کارخانوں پر ہندوؤں اور پارسیوں کا قبضہ ہے مسلمانوں کا حصہ صرف حسب ذیل ہے

رُوئی کے کارخانوں میں ۳/۴۰۰، جوٹ کے کارخانوں میں ۲/۲۵۰، کھوپرے سرسوں اور السی کے کارخانوں میں ۴/۱۶۰، چمڑے، ربڑ وغیرہ کے کارخانوں میں ۱/۴، نمک کے کارخانوں میں ۱/۴۰، کوئلہ اور لوہا کے کارخانوں میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں

ان حالات کی موجودگی میں علماء و اکابر ملت کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی کا کوئی حل ڈھونڈیں اور بیمہ اور انشورنس کے مسئلہ پر غور کریں۔ کیا بیمہ حرام ہے ؟

جائے غور ہے کہ یہ تحریمی حکم آیا واقعی کوئی اصلیت رکھتا ہی جبکہ ہمارے کروڑوں بھائی اپنی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے مرتد ہوجایا کرتے ہیں اور عیسائی مشینری کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

ہماری مذہبی درسگاہیں بھی روز بروز تباہی کی طرف چلی جارہی ہیں یہ حالت یقیناً دُور اندیش مسلمان کے لئے عبرت آموز ہے، اس کھلی ہوئی حقیقت کے پیش نظر ہمارے تعلیم یافتہ اور ان پڑھ بھائی علماء سو کے بجائے علماء دین سے رجوع کریں کہ کیا بیمہ واقعی حرام ہے ان کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ اسکی حرمت ایک افسانہ ہے۔

حضرت علامہ صاحب نے جو ہیمہ کی حلت میں دلائل پیش کئے ہیں وہ شبہات سے بالاتر ہیں، جو لوگ شبہات غلط تاویلات اور " مگر " کے عادی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کے بھی اسی طرح غلط تاویل کر کے قوم کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ میں خدائے تعالیٰ سے ثواب کی امید کرتا ہوں کیونکہ یہ خدمت مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر انجام دے رہا ہوں، میری دُعا ہے خدا کریم مسلمانوں کی دینی اور دنیوی مصائب جلد دور کرے آمین

مطیع اللہ الافغانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

زیر نظر کتاب حضرت رئیس عسکر، فاضل اجل، علامہ موسیٰ جاراللہ صاحب قبلہ کی ایک کتاب "تامین الحیاۃ والاموال والاملاک" کا اردو ترجمہ ہے۔ حضرت علامہ روس کے رہنے والے ہیں اور علماء اسلام میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، آپ کی ولادت ۱۸۷۵ء میں روس کے ایک شہر روستوف ڈان میں ہوئی، بچپن ہی سے آپ کو تحصیل علم اور سیاحت سے کافی دلچسپی رہی، نوجوانی میں مختلف ملکوں کی سیر کی چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ء میں ہندوستان کے علمی مرکزوں کا دورہ فرمایا اور اس زمانے میں آپ تین ماہ تک بھوپال میں بھی مقیم رہے!۔

آپ عربی، ترکی، اور روسی میں کافی مہارت رکھتے ہیں اس کے علاوہ بلغاروی، یگو سلاوی، فرانسیسی زبانیں بھی جانتے ہیں، فارسی

اور اُردو سے بھی کافی واقفیت ہے آپ کی ڈیڑھ سو کے قریب مطبوعہ کتابیں موجود ہیں، جن میں سب سے اہم کتاب، "القانون المدنی للاسلام" ہے، آپ کی تیس کتابیں عربی میں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے "فقہ القرآن" سب سے اہم اور بڑی کتاب ہے جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، فارسی میں "کلیات حافظ کی شرح" آپ کی مطبوعہ کتاب ہے، روسی زبان میں خود آپ نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ البتہ آپ کی متعدد کتابوں کا ترجمہ روسی زبان میں ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے متعدد مقالات اور مضامین روسی اخباروں میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں

آپ نصف دنیا میں گھوم چکے ہیں، بلاد یورپ میں فنلینڈ، ناروے سوئیڈن، پولینڈ، یونان، بلغاریہ، یگوسلاویہ، چیکوسلاواکیا، ہنگری، جرمنی، فرانس بلاد اسلامیہ قفقاز، ترکستان، ترکی، ایران، عراق، عرب افغانستان اور مصر آپ جا چکے ہیں جاپان اور چین کا بڑا حصّہ بھی آپ دیکھ چکے ہیں، دو مرتبہ ہندوستان بھی آپ آچکے ہیں، ان مختلف النوع ممالک کی سیاحت اور متعدد زبانوں کے ادب کے مطالعہ نے آپ میں فراخ حوصلگی، وسعت نظر، غور و فکر اور تعمق کی عادت اور پیچیدہ مسائل

کی باریکیوں تک پہنچنے کی ایسی اچھی صلاحیت پیدا کر دی ہے جسکی مثال دوسرے علماء میں بہت کم نظر آتی ہے۔

آپ کا بڑے بڑے مشاہیر اور نامور لوگوں سے ملنے کا بارہا اتفاق ہوا ہے جن میں کمال اتاترک مرحوم، نادر شاہ مرحوم، مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی، علی برادرانؒ، مفتی عبدہؒ (شاگرد رشید حضرت علامہ جمال الدینؒ افغانی) عصمت انینو سلطان ابن سعود، لینن، اسٹالین ٹراسکی وغیرہ شامل ہیں، آپ کے علم و فضل کی وجہ سے روس کے مسلمانوں پر آپ کا بڑا گہرا اثر ہے اسی وجہ سے ۱۹۲۳ء میں آپ کو جلا وطنی کی حالت میں روسی مسلمانوں نے متفقہ طور پر موتمر اسلامی کے واسطے روسی نمایندہ منتخب کیا، اور آپ نے موتمر میں روسی مسلمانوں کی نمایندگی فرمائی۔

مسلمان اور عالم ہونے کی حیثیت سے آپ بالشویک تحریک اور اس کے بعد آنے والی اشتراکیت یا اس کی ترقی پسند صورت اشتمالیت سے ذرہ برابر متاثر نہ ہوئے، اور آپ کا یہی عقیدہ رہا کہ تنہا اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اخوت، مساوات اور رواداری کی تعلیم دی ہے، اشتراکیت اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی، نیز دنیوی نقطہ نظر سے بھی ایک مفید حد تک

انفرادی آزادی اور ذاتی املاک کے جذبے کے بغیر دنیا کا کوئی نظام ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ عملی دشواریوں سے تنگ آ کر ان دونوں کو بڑی حد تک اشتراکی نظام میں داخل کر لیا گیا۔ ساتھ ہی آپ نے ان قدیم اسلامی درسگاہوں کی بربادی بھی دیکھی تھی جن میں زار کے زمانہ میں "تہ دیس" (روسی بنانا) پر اور بعد میں بالشویک یا اشتراکی بنانے پر زور دیا جانے لگا تھا آپ نے روسی مسلمانوں کو اس جال سے نکالنے کے لئے ان کے واسطے علیحدہ پنج سالہ تعلیمی نظام مرتب کیا۔ اشتراکی حکومت کو آپ کی یہ سرگرمیاں ناگوار گذرنے لگیں۔ مگر وہ آپ کے علمی احترام کی بنا پر آپ کو کوئی سخت سزا نہ دینا چاہتی تھی، اس لئے بڑی ردو قدح کے بعد آپ کو مختصر سی مدت کے لئے قید کر دیا۔ رہائی کے بعد آپ برلن چلے گئے، اور وہاں ایک کتاب "مراجعت من بہ ملل اسلامیہ" لکھی، جسکا روسی میں بھی ترجمہ ہوا، اور جب کچھ عرصہ کے بعد آپ روس آئے تو آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ لینن کی وفات کے بعد آپ کو رہا کر دیا۔ مگر پانچ سال کے لئے جلا وطن کر دیا۔ جلا وطنی کے بعد آپ واپس وطن لوٹ آئے۔ لیکن حالات ناسازگار تھے اس لئے آپ نے حکومت سے باہر جانے کی اجازت چاہی، مگر حکومت نے اجازت دینے

سے انکار کر دیا، اس بنا پر آپ خفیہ طور پر افغانستان آگئے اور وہاں سے ہندوستان ہوتے ہوئے چین اور پھر جاپان چلے گئے، آغاز جنگ سے قبل آپ جاپان سے پھر ہندوستان آئے، اگرچہ آپ کا کسی سیاسی جماعت یا انجمن سے کوئی تعلق نہ تھا مگر حکومت ہند نے آپ کو نظر بند کر دیا اور پانچ سال کے بعد رہا کیا۔ آپ کی نظر بندی کے آخری تین سال بھوپال میں گذرے جہاں آپ نے بڑی خاموشی سے زندگی گذاری اور آپکی تنہائی کا مونس اور غمخوار صرف مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا شوق تھا، چنانچہ بھوپال کے قیام کے دوران میں آپ نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے سات شائع ہو چکی ہیں۔

حضرت علامہ ایک ترقی پسند بزرگ ہیں۔ خدا کے قائل اور رسول کی اتباع کے دل دادہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "القانون المدنی للاسلام" میں یہ ثابت کیا ہے کہ جن اسلامی حکومتوں نے اسلامی قوانین کو چھوڑ کر یورپین قوانین اختیار کئے ہیں انہوں نے اچھا نہیں کیا ہے، وہ اشتراکیت کے پکے دشمن ہیں۔ سود نہ صرف دارالاسلام بلکہ دارالحرب میں بھی ناجائز اور حرام سمجھتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اسلام کے قوانین عام ہیں اور وہ

زمان اور مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ لہذا مقام یا وقت بدل جانے
سے ان میں کوئی تبدیلی یا لچک پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود
آپ جان اور مال کے بیمے کو نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ اس کو مفید خیال
کرتے ہوئے اس کی بیش از بیش اشاعت کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں
حالانکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستانی علماء کی اکثریت بیمہ کو ناجائز
قرار دیتی ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ "بیمے کی جتنی شکلیں موجود ہیں ان میں
سے کوئی بھی شکل ایسی نہیں جس میں ربا و قمار یا دونوں میں سے کوئی ایک
نہ پایا جاتا ہو، اب رہا یہ امر کہ بیمہ کے معاملات میں ربا و قمار کا ذکر نہیں کیا
جاتا بلکہ منافع بیمہ کو دوسرے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے، تو اس کی وجہ
سے حقیقتِ ربا و قمار شرعاً تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح کہ بیع عینہ بھی
ایک بیع ہی ہوتی ہے (مثلاً زید نے عمر سے ایک گھوڑا سو روپیہ میں قرض
خریدا اور رقم تین ماہ میں ادا کرنے کا وعدہ کیا، لیکن اسی اثنا میں زید کو
نقد رقم کی ضرورت ہوئی اس نے وہی گھوڑا عمر ہی کو پچاس روپیہ نقد میں
واپس فروخت کر دیا۔ نیز تین ماہ کے بعد قرض کے سو روپیہ اور مزید عمر
کو ادا کئے اسی قسم کی بیع کو بیع عینہ کہتے ہیں جو فقہا کے نزدیک حرام ہے)

حالانکہ ربا کا اس میں قطعی بھی تذکرہ نہیں ہوتا لیکن چونکہ اس میں بھی مآل کار حقیقت ربا پائی جاتی ہے اس وجہ سے باوجود عدم تذکرہ ربا کے وہ بھی ناجائز ہے۔"

بعض علماء اس کو تاوان اور آمدنی غیر مکتسب کہتے ہیں اور یہ دونوں مسلمانوں کے لئے ناجائز ہیں اس لئے بیمہ کا جواز بھی ثابت نہیں ہوتا حضرت علامہ نے جس نقطہ نظر سے بیمے کے مسئلے کو پیش کیا ہے، وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر مسلمان عموماً اور علماء کرام خصوصاً غور فرمائیں، اس پر اعتراض کی خاطر نظر نہ ڈالنا چاہیئے بلکہ ٹھنڈے دل سے تمام نکات کو سامنے رکھ کر کوئی مختتم فیصلہ کرنا چاہیئے۔ دراصل بیمہ وقت کی ایک اہم پکار ہے اس کو سرسری نظر سے دیکھ کر ٹالا نہیں جا سکتا ہے۔

بعض ملکوں میں اس نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ انگلستان میں آج کل "نیشنل انشورنس بل" پر جو بحث ہو رہی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ وہاں کی ساری آبادی کا بیمہ کر دیا جائے۔ جس کا مقصد بیماری، اور بے روزگاری کا بیمہ ہر قسم کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد پنشن، امداد زچگی، خاندانوں، بیواؤں، اور یتیموں کی کفالت، اور اموات کی صورت

میں امداد وغیرہ جیسی شکلیں شامل ہوں گی۔ یہ ہر شخص کو کرانا ہوگا، خواہ وہ امیر ہو یا غریب اگرچہ اس اسکیم کے ابتدائی مصارف ۴۵ کروڑ پونڈ ہونگے مگر اس کا مقصد انگلستان کے ہر باشندے کی مصیبت اور پریشانی کے زمانے میں کفالت اور دستگیری ہوگا۔

میں کوئی عالم نہیں، مولوی نہیں، ملا نہیں، حتی کہ دینی علوم کا مبتدی تک نہیں، مگر میری خواہش ہے کہ اس مسئلے پر غور کرتے وقت اگر میری مندرجہ ذیل معروضات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو شاید فیصلہ کرنے میں کوئی مدد مل جائے۔

(ا) سب سے پہلی صورت تاوان کی ہے، یعنی جب کسی بیمہ کنندہ یا اس کے ورثہ کو مدت معینہ سے قبل اور مقررہ اقساط داخل کئے بغیر کسی ناگہانی اور غیر متوقع سبب کی بنا پر پوری رقم ملتی ہے تو کیا اس کی شکل تاوان کی ہو جاتی ہے، درحقیقت تاوان وہ معاوضہ ہے جو کسی کو نقصان پہنچا کر حاصل کیا جاتا ہے، لیکن یہاں کمپنی نقصان نہیں اٹھاتی بلکہ وہ زائد رقم اپنے محفوظ فنڈ سے ادا کر دیتی ہے۔ پھر چونکہ کاروبار بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اس لئے ایک نقصان کی تلافی دوسری طرف کے نفع سے ہو جاتی ہے۔ کمپنی کو

ذاتی طور پر کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ہر کاروبار نفع کی خاطر کیا جاتا ہے۔ نقصان کی صورت میں اچھی سے اچھی کمپنی بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اموات کے مقابلہ میں پیدائش کی شرح زائد رہتی ہے۔ یہی صورت ناگہانی اور غیر متوقع حادثوں کی ہے جو جملہ بیمے کے تناسب سے بہت کم پیش آتے ہیں۔

لہذا مجموعی حیثیت سے کمپنی کو کوئی تاوان دینا ہی نہیں پڑتا ہے

(۲) دوسری صورت غیر مکتسب آمدنی کی ہے، مگر ہر غیر مکتسب مکروہ اور ناجائز نہیں ہوتی، مثلاً کسی دوست یا عزیز کا عطیہ، ورثہ یا ترکہ میں معقول رقم کا ملنا، خون کا معاوضہ کسی کی اعانت اور امداد بھی غیر مکتسب آمدنیوں کے ذیل میں آتی ہے، مگر اسلام میں ان کی ممانعت نہیں ہے یہی صورت بیمہ کی ہے۔ جہاں تعاون اور شراکت کے تحت ایک رقم ملتی ہے۔

(۳) جو کسی کمپنی میں بیمہ کراتے ہیں وہ کمپنی کے شراکت دار بھی بنجاتے ہیں کیونکہ کمپنی ہر دوسرے یا تیسرے سال اپنے جملہ کاروبار کا حساب لگاکر منافع علیحدہ نکال دیتی ہے۔ اور اس میں سے کچھ رقم محفوظ فنڈ میں داخل کر کے باقی رقم "بونس" کے نام سے جملہ حصہ داروں میں تقسیم کر دیتی ہے

اس منافع کی مقدار معین نہیں ہوتی۔ کسی مرتبہ زیادہ ہوتا ہے اور کسی مرتبہ کم۔ اور کبھی بالکل نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے کاروباروں میں ایک مقررہ شرح سے کم منافع ملنا یا منافع کا بالکل نہ ملنا بھی ایک قسم کا نقصان ہے۔ اور جب شراکت دار کسی کاروبار کے نفع اور نقصان میں برابر کے ہی شریک ہوں تو ایسا کاروبار ناجائز نہیں ہو سکتا۔

(۴) ایک اعتراض یہ ہے کہ بیمہ کمپنیاں سودی کاروبار کے ذریعہ نفع حاصل کرتی ہیں اور جب ان کے سرمایہ میں سود کا جزء شامل ہو جاتا ہے تو مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو آج ہر قسم کی سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتیں ناجائز ہو جاتی ہیں کیونکہ تنخواہ، وظیفہ، امداد، منصب یا پنشن جو سرکاری خزانوں یا غیر سرکاری تحویلوں سے ملتی ہیں ان میں مشتبہ اور ناجائز آمدنیوں کا جزء شامل ہوتا ہے۔ کیونکہ حکومت کے خزانوں میں سود اور شراب وغیرہ کی آمدنی بھی داخل ہوتی ہے اور ان کو الگ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں۔ ساری آمدنیاں ملا دی جاتی ہیں۔ اور ان ہی میں سے تنخواہیں اور وظیفے ادا ہوتے ہیں۔ میرے خیال سے تو وہ اسلامی حکومتیں بھی جو سود اور شراب وغیرہ کی آمدنیوں کے جواز

کی قائل نہیں ہیں اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ آجکل بین الاقوامی صورت ایسی ہوگئی ہے کہ ان میں سے بیشتر حکومتوں کو معاہداتی طریق کے تحت غیر اسلامی حکومتوں سے ساحلی سمندروں یا فضائی راستوں کے استعمال کا معاوضہ یا معدنیات وغیرہ کے اجاروں کی رقم ملتی ہے جو غیر اسلامی حکومتوں کے ان خزانوں سے ادا ہوتی ہے جہاں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں، اور اس طرح یہ جزو اسلامی حکومتوں کے خزانوں کی پاک رقموں کو بھی گندہ کر دیتا ہے۔ اس طرح تو یہ مسئلہ بجائے سلجھنے کے اور زیادہ الجھ جائے گا۔ غالباً یہ مشکل صرف اس طرح حل ہو سکتی ہے کہ اگر اس کو یوں دیکھا جائے کہ جس آدمی کو جس خدمت یا کام کا معاوضہ مل رہا ہے وہ خدمت یا کام فی نفسہ حرام، ناجائز اور مکروہ تو نہیں۔ دوسرے وہ خدمت دیانتداری اور صداقت کے ساتھ انجام دی جا رہی ہے یا نہیں؟ اگر یہ دونوں صورتیں موجود ہیں تو اس کو جو معاوضہ مل رہا ہے وہ اس کے لئے جائز اور حلال ہے یہی صورت بیمہ کی ہے، یعنی اگر بیمہ کنندہ یا اس کے وارث خود سود نہیں لیتے تو ان کو کمپنی سے جو رقم ملتی ہے وہ ان کے لئے جائز ہے۔

(۵) اسلام کے دو مسائل قسامہ اور دیت میں بڑی مشابہت

پائی جاتی ہے۔ قسامہ یعنی خون کی صورت میں محلے والوں پر قسم کے لازم آنے کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی محلے میں مقتول پایا گیا جس کے قاتل کا حال معلوم نہیں تو مقتول کا وارث اس محلے والوں میں سے پچاس آدمی چھانٹے اور اُن سے یہ قسم لی جائے کہ بخدا نہ ہم نے قتل کیا۔ اور نہ ہم اس کے قاتل کو جانتے ہیں، قسم کھا لینے کے بعد محلے والوں پر مقتول کی دیت لازم ہوگی۔ اگر مقتول دریا کے کنارے لٹکا یا بندھا ہوا ملے تو جو گاؤں وہاں سے زیادہ نزدیک ہوگا اس پر قسامہ لازم آئے گا۔ اگر مقتول کشتی میں ملے تو جو اس میں سوار ہوں اور ملاح ہوں اُن پر دیت اور قسامہ لازم آئے گا۔ اگر مقتول شارع عام یا جامع مسجد میں ملے تو دیت بیت المال سے دی جائے گی یہی صورت عام دیت کی ہے کہ دیت قاتل پر لازم ہے اگر اس میں دیت ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو اس کی برادری یا رشتے داروں پر، اور اگر اس کے قبیلے کے لوگ اتنے نہ ہوں کہ اس حساب سے پڑت پڑ سکے تو اس میں عصبات کی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے قبیلے یا رشتے داروں کو ملایا جا سکتا ہے اور اگر سارے قبیلے میں دیت ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو بعض اور صورتوں میں بیت المال میں تمام مسلمانوں سے دیت دلوائی

جائے گی۔

اِن مسائل پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اول تو اسلام نے ہر مسلمان کی جان کا ضمان اور کفیل ساری مسلم قوم کو بنایا ہے۔ اور اگر وہ اپنے اس فرض کو انجام نہ دے تو اس کو اس کا کفارہ دیت کی شکل میں ادا کرنے پر تیار رہنا چاہیئے، جو ایک کفالت عمومی کی شکل ہے۔ دوسرے اس کفالت عمومی کو اس قدر اہمیت دی کہ بعض صورتوں میں تاوان تک کو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ مثلاً قسامہ کی صورت میں اگر مقتول کو محلے والوں یا مقام قتل کے پاس والے گاؤں والوں نے قتل نہیں کیا اور قاتل کا کوئی پتہ نہ چلا تو عوام کو جو دیت دینا پڑے گی در اصل وہ تاوان ہی ہوگی۔ بلکہ وہ اس صورت میں بھی تاوان ہے جبکہ وہ قسم کھاتے ہیں کہ "نہ تو ہم نے قتل کیا اور نہ ہم قاتل کو جانتے ہیں" لیکن ان سے دیت دلوائی جاتی ہے۔ تیسرے دیت کا جو معاوضہ بصورت رقم یا جنس ادا کیا جاتا ہے حقیقتاً وہ مقتول کے گوشت اور پوست کا معاوضہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذمہ داریوں، فرائض، اور کفالتوں کا معاوضہ ہے جو مقتول پر بحیثیت باپ، شوہر، اولاد یا اور کسی رشتے کے لحاظ سے عائد ہوتی تھیں۔ گویا اسلام

قتل (یعنی ناگہانی موت کی ایک صورت) میں پسماندگان اور اعزا کی کفالت پر بڑا زور دیتا ہے۔ یہی صورت بیمہ کی ہے جہاں قبل از وقت موت یا حادثے کی صورت میں اس کو یا اس کے وارثوں کو خاندان کی کفالت کے واسطے شراکت عمومی میں سے ایک رقم (جو معین ہو چکی ہے) مل جاتی ہے جو نہ قمار ہے نہ تاوان، اور نہ غیر مکتسب آمدنی۔ اور نہ داخل شدہ رقم کا سود ہو سکتا ہے۔ کیونکہ فرض کیجئے ب نے پچیس سال کے واسطے ایک ہزار روپیہ کا بیمہ کرایا۔ اور ابھی اس نے صرف ۶ ماہ کی قسطیں یعنی پچیس روپیہ داخل کئے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اور کمپنی کے شرائط کے مطابق ورثہ کو ایک ہزار روپیہ مل گیا ظاہر ہے کہ ۹۷۵ روپیہ کی رقم جو زائد ملی وہ کسی صورت میں بھی پچیس روپیہ کا چھ ماہ کا سود نہیں ہو سکتی۔

بیمے کے سلسلہ میں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنی رقم کا بیمہ کراتا ہے تو اس کی پالیسی پختہ ہونے کے بعد اس کو جو زائد رقم ملتی ہے وہ سود ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں بلکہ قسطوں پر جو رقم پھیلائی جاتی ہے۔ وہ سب ملا کر اس رقم سے زائد ہو جاتی ہے جتنی رقم کی اصل پالیسی کہلاتی ہے، اور پالیسی پختہ ہونیکے

بعد جو رقم ملتی ہے در اصل وہ وہی زائد رقم ہوتی ہے جو خود بیمہ کنندہ نے زائد داخل کی تھی منافع والی پالیسی میں وہ "بونس" اور شامل ہو جاتا ہے جو پچیس سال کے عرصہ میں کمپنی نے وقتاً فوقتاً تقسیم کیا ذیل کے نقشے سے یہ چیز اور واضح ہو جائے گی۔

عمر بوقت بیمہ	مدت بیمہ	سالانہ قسط	ادا ہونیوالی رقم	قیمت اصل پالیسی
۴۵ سال	۲۵ سال	۵۰/۰	۱٬۲۵۰	۱٬۰۰۰
	زائد رقم جو ادا کی گئی ۲۵۰	بغیر منافع والی پالیسی		

عمر بوقت بیمہ	مدت بیمہ	سالانہ قسط	ادا ہونیوالی رقم	قیمت اصل پالیسی
۴۵ سال	۲۵ سال	۵۷/۶	۱٬۴۴۴	۱٬۰۰۰
	زائد رقم جو ادا کی گئی ۴۳۴/۶	منافع والی پالیسی		

زیادہ سے زیادہ احتیاط کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان غیر منافع والی پالیسی خرید لیا کریں تاکہ "بونس" کی شکل میں جو منافع ملتا ہے اور جس میں سود کے جزو کا شامل ہونے کا احتمال ہے اس سے بھی محفوظ رہ سکیں۔

مجموعی حیثیت سے ہندوستان میں بیمے کا رواج بہت کم ہے ۱۹۳۶ء
میں بیمہ کمپنیوں کی تعداد ۳۰۹ تھی جن میں ۱۴۷ بیرونی کمپنیاں تھیں اور خالص
منافع کی تعداد ۲٫۴۷ ۲ کروڑ روپیہ تھی جس میں سے صرف ۴۷ لاکھ ہندوستانی
کمپنیوں کا منافع تھا اور باقی دو کروڑ ایک لاکھ غیر ہندوستانی کمپنیوں کا
اگرچہ بدیسی کمپنیوں کی تعداد کم تھی مگر ان کا منافع زائد ہونے کی یہ وجہ ہے
کہ یہ "زندگی" جائداد، عمارتوں، آگ، جہاز رانی وغیرہ مختلف کاموں کا
بیمہ کرتی ہیں اور ہندوستانی کمپنیاں زیادہ تر زندگیوں کا بیمہ کرتی ہیں
اور اس میں منافع کم ہوتا ہے۔

ملک میں ۲۳۲ ہندوستانی کمپنیاں ہیں اور ان میں صرف دو مسلمانوں
کی کمپنیاں ہیں اور ۱۰۸ کمپنیاں ایسی ہیں جن میں ایک ایک مسلمان
ڈائرکٹر اور چند حصے دار مسلمان ہوتے ہیں مگر ان سب کی تعداد ایسی ہی
ہے جیسے آٹے میں نمک اس لئے سخت ضرورت ہے کہ نہ صرف مسلمان
بیمہ کی طرف توجہ کریں بلکہ مسلمان اپنی کمپنیاں بھی قایم کریں اور اس کاروبار
بار کو بھی زیادہ سے زیادہ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش ہونا چاہیئے۔

ہندوستان ایک غریب ملک ہے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں
یہاں کی سالانہ اوسط آمدنی کا معیار بہت ہی ادنیٰ ہے۔ لکھ پتی اور کروڑ پتیوں
کا تناسب آبادی کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے۔ اور ہندوستانی مسلمان
ہندوستانی قوموں سے اکثر پست اور مفلس ہیں، کیونکہ یہ تجارت اور کاروبار
میں زیادہ مشغول نہیں مسلمانوں میں جو خال خال خوش حال نظر آتے ہیں۔
ان کے اخراجات بھی زیادہ، معیار زندگی اعلیٰ، اور ان کو پس اندازی کی عادت
بالکل نہیں۔ اس لئے جب وہ ناگہانی طور پر کسی حادثے یا موت کا شکار ہو
جاتے ہیں تو ان کے پس ماندگان اور اعزا کا جو حال ہوتا ہے، اسکی سینکڑوں
مثالیں ہم روزمرہ اپنے گرد وپیش دیکھ سکتے ہیں۔ مفلسی اور تنگدستی سے
عاجز آکر ہر سال سینکڑوں بیوائیں اور یتیم لاوارث بچے مشنری اور دوسرے
مبلغوں کے آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ضرورت ہے کہ ایسے
خاندانوں کی کفالت کی جائے، اور اس کے واسطے بیمہ سے بہتر کوئی چیز نہیں
بہت سے خوش حال گھرانے بگڑ جانے کے بعد نہ تو اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم
دلا سکتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کی شادی کر سکتے ہیں لیکن ان کو کوئی دقت نہ
ہو اگر یہ تعلیمی پالیسیاں اور شادی کی پالیسیاں خرید لیں، اور ہر ماہ ایک چھوٹی سی

رقم داخل کر کے ضرورت کے وقت ایک معقول رقم پانے کے مستحق ہوجائیں

حضرت علامہ نے مسلمانوں کو اپنی اموال کے ایک حصے کو بصورت وقف کرانے کا جو مشورہ دیا ہے وہ بہت ہی صائب ہے، بلکہ میری رائے میں تو موجودہ اوقاف کا بیمہ ہوجانا بھی ضروری ہے تاکہ ایک طرف تو اوقاف کی موجودہ خرابیوں کی اصلاح ہو سکے، اور دوسری طرف مستحقین وقف صحیح طور پر استفادہ کر سکیں، جو واقفین کا اصلی مقصد ہوتا ہے، یہ نہ ہو کہ اوقاف محض چند آدمیوں کے قبضے میں جا کر ان کی ہوس وجاہ پرستیوں کا شکار بن جائے آج کل مسلمانوں کے اوقاف کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے، اس سے واقف کار حضرات بخوبی واقف ہیں اور غالباً وہ اس کی پوری پوری تائید فرمائینگے

مولوی مطیع اللہ خاں صاحب افغانی جنہوں نے اس رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے خود ایک دردمند اور صاحب بصیرت انسان ہیں ان کے دل میں قوم کی خدمت کی سچی تڑپ ہے، ان میں خاموشی سے کام کرنے کی عادت ہے، وہ مسائل حاضرہ سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں، اردو دان طبقہ کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ایک علامہ روزگار، فاضل اجل کے گرانقدر

اور قیمتی خیالات سے ہمیں روشناس کرایا، اور غالباً علامہ کی یہ پہلی کتاب ہی جس کا ترجمہ اُردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اہل علم سے گذارش ہی کہ اگر ترجمہ یا مقدمہ میں کوئی لغزش نظر آئے تو اس کو نظر انداز فرما دیا جائے کیونکہ اصل مقصد روح ہے نہ کہ ظاہری رنگ اور روپ اور نہ اہلِ دانش ایسی معمولی باتوں کو اہمیت دیا کرتے ہیں۔ فقط۔

محمد احمد سبزواری ایم، اے

بھوپال

اصل مضمون کا ترجمہ

لائف انشورنس اور بیمہ خواہ بڑھاپے، عجز، اور موت کے بعد پیش آنے والے خطرات کی انسداد اور اندفاع کی بنا پر کرایا جائے، یا کسی بھی ایسی تباہی اور نقصان رسیدگی کی پیش بندی کے لئے کرایا جائے جب انسان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی انجام دہی سے عاجز اور بے بس ہو جاتا ہو، تو یقیناً ایک اچھی اور بہترین دور اندیشی ہے، لائف انشورنس اور بیمہ یا اس قسم کی دوسری کمپنیاں سب کی سب اقتصادی خوش حالی کے خاطر وجود میں لائی ہوئیں تمدنی اور شہری مفاد کی ایجادات ہیں، کچھ عرصہ پہلے انسان ان کے نام سے بھی ناواقف اور ناآشنا تھا، لیکن آج ہر فرد بشر بلا تخصیص ایک کفالت عمومی کی شکل میں اس سے مستفید ہوتا ہے، دنیا کے مظلوم اور غریب افراد، تمدن اور تہذیب یافتہ دنیا کے باشندے ایک عرصہ دراز سے اس کفالت عمومی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، چنانچہ

سالہا سال کی جانفشانی کے بعد دنیا کی کاوشیں بارآور ثابت ہوئیں، اور
یہ کامیابی بھی انسانی سوسائٹی کے انہی علماء، فضلا، اور برگزیدہ افراد کی
مرہون منت رہی جو ہمیشہ انسانیت اور دنیا کی مظلوم آبادی کی بھلائی اور
خوش حالی کی خاطر ایک سرگرم جدوجہد اور انتھک کوششوں میں منہمک رہتے
ہیں۔ سینکڑوں تکلیف دہ تجربات کے بعد وہ اپنی مسلسل محنتوں کے پھل
سے انسانیت اور بشریت کی عام آبادی کو مستفید کرتے ہیں انسانیت
کی شہری اور تمدنی ترقی ہمیشہ ان ہی اولوالعزم، اور باہمت افراد کی اَن گنت
کوششوں کے سر رہی ہے، بشریت کا ارتقا آسمانی پرواز، برّی اور بحری
سہولتیں اور آسانیاں بھی ان ہی کی بے شمار محنتوں، اور بے نظیر کوششوں
کے ثمرات اور نتائج ہیں، اقتصادی مشکلات اور تمدنی راستوں کی رکاوٹیں
بھی صرف یہی حضرات دور کر سکے۔ اس قسم کی تمام جدید اسکیمیں جو اجتماع انسانی
کی بھلائی کی خاطر وجود میں لائی جاتی ہیں وہ سب کی سب ان حضرات علماءؑ
اہل تجربہ، اور مجتہدین کرام کے دماغوں کے ثمرات ہوتے ہیں جو سالہا سال
تک ان تجربات میں بشریت کی بھلائی کے خاطر صرف کرتے ہیں ان تدابیر
کو وجود میں لانے کے بعد ان کی عام منفعت سے ہر شخص بغیر کسی تخصیص کے

مستفید ہوتا ہے، امیر اور غریب یکساں طور پر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے
یہ ایک ایسی کھلی ہوئی اجتماعی حقیقت ہے جس کے مشاہدہ کے لئے معمولی
سی بصیرت اور ذراسی بینائی کی ضرورت ہے۔ تاریخ کے مختلف دور
سے اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ کفالت عمومی کا فائدہ ہر عصر میں کتنا
عام رہا ہے، اسی کھلی ہوئی حقیقت کی طرف خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا، وان اللہ لمع المحسنین" ۲۹ : ۶۹

جن لوگوں نے (ہماری رضامندی کی خاطر) ہماری راہ میں جد وجہد کی ہم ضرور ان کو نیک راستے بتائیں گے، بلاشک وشبہ خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

انسانیت کی بھلائی اور فلاح کے وسائل فراہم کرنے کے لئے
خواہ کوئی بھی کوشش کرے اس شخص کا اس آیت کریمہ کے عموم میں داخل
ہونا ایک یقینی امر ہے، یہ کسی کے بھی بس کی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ
کی کتاب میں تحریف کرے یا اس کے نظم کو بدل دے، کتاب اللہ کے
کسی عام حکم کی تخصیص کرے، اور نہ کسی کی اتنی طاقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ
کے کسی عام کے فائدے کو خاص کرے۔

(۱) مال کا بڑھنا اور زیادہ ہونا ایک طبعی اور فطری امر ہے، اسی طرح (۲) مال از روئے شریعت اسلامیہ ایک قسم کا چشمہ خیر ہے جو ہمیشہ جاری ہے، اور اس کے علاوہ (۳) مال اپنی منفعت عامہ کے اعتبار سے اجتماع انسانی کے لئے اپنی دینوی خوبیوں کے ساتھ ایک قسم کا خداوندی آرام و آسایش ہے مندرجہ بالا تینوں خوبیوں کو خداوند دوجہان نے ہر قسم کے مال میں ودیعت اور امانت کیا مال کی نمو اور زیادتی کا ہر شخص مختلف طریقوں سے مشاہدہ کرتا ہے، کاشتکار کھیتی میں، باغبان باغ میں، نسل کش نسل کشی میں، تاجر تجارت کی منڈیوں میں غرض ہر شخص مختلف طریقوں سے اس کی منفعت کا اندازہ لگا سکتا ہے، لیکن آج کل مال کی منفعت کے ایسے ایسے وسائل فراہم ہو چکے ہیں جو پہلے نہ تھے، اور ان سے صرف بزرگترین سلطنت اور بڑے سے بڑا بادشاہ زیادہ سے زیادہ اقتصادی فائدہ اٹھاتا ہے آج کل درحقیقت ان ہی ملکوں کی سلطنتیں ہیں جو اقتصادیات میں بے نظیر مہارت رکھتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں ثروت اور دولتمندی تہہ بتہہ رکھے ہوئے منجمد سرمایہ کا نام تھا جو معادن، کان، اور خزانوں کی صورت میں ہوا کرتا تھا ان خزانوں کے دروازے مقفل تھے، ان کی کنجیوں کی ڈھیر بھی بذات خود

ایک بڑا بوجھ ہوا کرتا تھا۔

لیکن آج دولت اور سرمایہ کے ڈھیر کی کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں، اور نہ اس کے مالک کا کسی گروہ میں شمار ہے، نہ ایسی دولت سوسائٹی یا خود مالک مال کے لئے مفید تصور کی جاتی ہے، جب تک کہ وہ اقتصادیات کے ماہر اور ذہین لوگوں کے ہاتھ میں گردش نہ کرے، جس کو یہ لوگ موقعہ سے کسی مفید تجارتی کاروبار میں اپنی اقتصادی مہارت اور تجارتی ذہانت سے استعمال کرتے ہیں بعض اوقات اتنا کثیر نفع کماتے ہیں جو راس المال اور اصل سرمایہ سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے، یہ ذہانت اور تجربہ جس سے اقتصادیات کے بڑے بڑے ماہر فائدہ اٹھاتے ہیں کوئی مذہبی یا فقہی شو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا بعض اوقات تو اقتصادی ماہر مال کو اس طرح گردش دیتے ہیں جہاں ربا اور سود کا نام تک نہیں ہوتا ہے، چہ جائیکہ اس کا اثر یا وجود ہو۔

اسی اصلی دلیل اور اسی بنیادی علت کی بنا پر خدائے تعالیٰ نے سرمایہ اور دولت کے ڈھیر لگانے کو حرام فرمایا ہے، (۹ : ۳۴) کیونکہ مال کا بہترین نفع امتداد اور گردش ہی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے، نہ یہ کہ

سونے اور چاندی کے ڈھیر لگائے جائیں کیونکہ مال کا بہترین معاون اور مددگار ثابت ہونا۔ اس صورت کے بغیر ناممکن ہے۔ زکوٰۃ کے بار بار فرض ہونے کا بھی یہی علت ہے، اس لئے کہ نصاب کا مقتضیٰ اور منشا ہی یہ ہے کہ ضرورت سے زائد دولت اور مال سے نفع حاصل کیا جائے اور مالک مال کا یہ فرض ہے کہ وہ منڈی میں اپنے مال سے مختلف طریقوں سے فائدہ اٹھائے نہ یہ کہ گھر میں ڈھیر لگائے اور اس کے وجود کی پوجا کرے)

ارشاد خداوندی؛

"كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ" تاکہ دولت صرف امراء ہی کے قبضوں نہ رہے۔ ۷:۵۹

ہماری رہبری فرماتا ہے کہ قانون الٰہی کا مقتضا ہی یہ ہے کہ مال کو زیادہ سے زیادہ امتداد اور پھیلاؤ کا موقعہ دیا جائے تاکہ سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ افراد اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اجتماع انسان کو ہر قسم کی آرام اور آسایش نصیب ہو، افلاس وغریبی انسانیت سے دور ہو، مدنیت اور شہریت بشری ہمیشہ سیراب اور خوش حال رہے۔

لفظ "انفاق" جو آیت کنز (۹: ۳۴) میں مذکور ہے اور بھی اس کے علاوہ جتنے مقامات پر یہ لفظ مذکور ہوا ہے اس سے بھی یہی مقصد ہے کہ مال دولت کو نفع بخش اور مفید طریقوں پر استعمال میں لانا چاہیئے تاکہ افراد ایک دوسرے کے دست نگر اور محتاج نہ رہیں، اور اس طرح انسانی سوسائٹی کے غریب افراد کسب حلال اور سودمند کمائی کے عادی بن جائیں اگر انفاق سے مروج معنی مراد لئے جائیں کہ لوگ صدقات اور خیرات کے عادی بن جائیں اور صدقات اور خیرات ہی کو ذریعہ معاش بنائیں تو انفاق کا نتیجہ گداگری ہی ہوگا، جو مفید ہونے کی بجائے ایک کھلی ہوئی ھلاکت اور تباہی ہے، اور اسی کا پھل ہے جس کو آج کل ہم چکھ رہے ہیں۔

کتاب اللہ نے شرعی نقطہ نظر سے صرف مال کے وجود ہی کو امداد باہمی اور بہترین کفالت عمومی کا ایک جاری چشمۂ خیر قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ تجارتی اور منفعتی صورت میں اس کے ڈھیر کے ڈھیر آسمان کی طرف عمودی شکل میں مرتفع ہوں، بلکہ اس نے انسان کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ دولت کو پہلے تجارت اور منفعت عمومی کیلئے

سطح زمین پر افقی شکل میں پھیلایا جائے تاکہ ہر فرد و بشر مساویانہ طور پر اس سے مستفید ہو سکے، اور آخر کار نتیجے میں عمودی شکل میں اپنی مرکز کی طرف لوٹے، تاکہ اجتماع انسانی اور شہری سوسائٹی میں کوئی ایک بھی محتاج اور غریب نہ رہے، اور دنیا کی آبادی کا ہر فرد خوش حالی سے زندگی بسر کر سکے۔ اگر مال اور دولت کا استعمال اس طریقہ پر نہ ہو تو دولت یقیناً خدا کے حکم کے خلاف ایک مٹھی بھر افراد کے ہاتھ میں اکٹھی ہوگی اور اس فعل قبیح کا نتیجہ سوائے قتل و خونریزی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو دنیا میں جتنی بھی لڑائیاں لڑی گئی ہیں اکثر اسی غلطی اور بے انصافی کا نتیجہ ہیں۔ تمدن اور شہریت کو جب بھی نقصان پہنچا ہے وہ اسی کوتاہی کا ثمرہ ہے، انسانی آبادی اور اچھی مدنیت جب بھی تباہ اور برباد ہوئی ہے صرف اسی غلط اصول اور خود غرضی سے ہوئی ہے۔

کسی مذہبی فقیہ، دینی پیشوا، یا گذشتہ زمانے کے دینوی وسائل کے مقلد کا ان موجودہ کاروباری وسائل پر بے سوچے سمجھے اعتراض کرنا یقیناً لغو اور بے بنیاد ہے، اگر ان میں سے کسی حضرت کا قول اعتراض کی حد سے بڑھ کر تحریمی حکم تک پہنچے تو بلا شک و شبہ یہ نہ صرف ان کی

زیادتی ہی ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ایسے حضرات کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کے متعلق خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

" شرعوا لهم من الدّين مالم يأذن به الله:"	انہوں نے عوام کے لئے ایسا دین ایجاد کیا جس کی کہ خدا نے اجازت نہیں دی ہے
" قل الله اذن لكم ام على الله تفترون:"	کیا خدا نے تم کو ایسا کرنے کی اجازت دی ہے یا تم خدا پر جھوٹ بولتے ہو؟

مقلدین کے ایسے استدلالات جو کسی چیز کی حلت اور حرمت یا جواز اور عدم جواز کے متعلق ہوتے ہیں ان کی بنیاد عموماً دو باتوں پر ہوتی ہے،

(۱) یا تو وہ اپنی نادانستہ جہالت کی وجہ سے ایسے استدلالات پیش کرتے ہیں

(۲) اور یا پھر دانستہ طور پر اپنے استدلال کی غلطی کو جانتے ہوئے وہ ایسا کرتے ہیں اور اس طرح عوام کو غلط راستہ پر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی چیز کو بطور احتیاط کے حرام قرار دے تو اس کے اس احتیاطی حکم میں اور کسی حلال چیز کو حرام قطعی قرار دینے میں کوئی فرق نہیں اس احتیاط کی بیماری نے اکثر لوگوں سے یا تو حلال قطعی کو حرام کرایا

اور یا حرام قطعی کو حلال کرا دیا۔ حالانکہ ہمارے لئے یقین کے سوا کوئی بھی بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا اور ہم کو اسی یقین ہی کا اعتبار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ صرف یہی ہماری نجات کا راستہ ہے۔ احتیاط سے استفادہ کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ نہ تو احتیاطاً ہم کسی چیز کو حلال قرار دیں اور نہ حرام تاوقتیکہ ہم کو کوئی نص صریح نہ مل جائے۔ ہاں احتیاط سے اس وقت ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ جب کہ کسی چیز کے حلال قرار دینے میں انسانیت کی خاطر کوئی کھلی ہوئی فلاح نظر آجائے اور یا کسی امر کے حرام قرار دینے میں ہم کو کوئی کھلا ہوا افساد نظر آجائے گویا حلت اور حرمت میں ہمیشہ فلاح یا فساد مدنظر رہنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہر احتیاط جو دین میں زیاتی پیدا کرتی ہو یا اس کے سبب سے دین میں نقصان کا خوف ہو وہ یقیناً لغو، بے سود، اور باطل مطلق ہے۔ ہر سچے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی احتیاط کو احتیاط کی تلقین کرنے والے کے سر پر دے مارے خداوند عالم کے ارشاد گرامی کا بھی یہی مقصد ہے۔

"ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلالُ وھذا حرام	جن چیزوں کی تمہاری زبانیں وصف اور تعریف کرتی ہیں۔ انکو حلال یا حرام

لتفتروا علی اللہ الکذب ؕ کہہ کر خدا پر جھوٹ کی تہمت نہ لگاؤ۔

جس علمیت اور عقلیت کو تسلیم کرنے سے کوئی نص شرعی انکار کرے تو اس سے کسی بھلائی کی امید نہیں، اور جس دعوی کی حقیقت اور صحت کا اعتراف علم اور عقل نہ کرتے ہوں، اس سے بھی کسی فائدہ اور فلاح کا واسطہ نہیں ہے۔ ہاں جو علم اور عقل کے خلاف برائی کا ارتکاب نہ کراتا ہو، اور نہ فضیلت بشری، اور صلاح عام کو ہاتھ سے جانے دیتا ہو، بلاشک و شبہ شریعت الٰہی اور دین اسلامی بڑی خوشی سے اس کا استقبال کرتا ہے، غرض یہ کہ دین خداوندی ہر شرافت اور فضیلت، بھلائی اور صلاح بشری کا خیر مقدم کرتا ہے۔

چونکہ لفظ "تامین" (جو بیمہ کے معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے) اپنے معنی کے لحاظ سے خاص اور ظاہر ہے اس لئے میں اسکو اس مسئلہ بیمہ میں بار بار ذکر کرتا ہوں، اور لفظ "تامین" قرآن کریم میں متعدد جگہ مذکور ہے۔ مثلاً "ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمناً"

قرآن نے عموماً لفظ "امن" کو ذکر کیا ہے جیسے،

"ءامنتم من فی السماء ان یرسل علیکم حاصباً"۔

اسی معنی میں لفظ "ایمان کا بھی ذکر ہوا ہے ؛

"وَاٰمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ" (۱۷:۶۷)۔

میرا جی یہ گوارا نہیں کرتا ہے کہ اس مقدس لفظ "تامین" کو عامیانہ رواجی محاورات میں استعمال کر کے رسوا کروں، اور نہ یہ دل پسند کرتا ہے کہ اس لفظ کو کمپنیوں کے اسما اور نام کے لئے مروج کرادوں، خواہ وزن افعال عربی میں کتنی وسعت اور گنجایش کیوں نہ ہو۔ ادب عثمانی میں اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے لفظ " سیغورطه" استعمال کیا جاتا ہے میرے خیال میں یہ اصطلاح انگریزی لفظ (Security) سے وضع کی گئی ہے، جس کے معنی تامین اور حفاظت کے ہیں۔ فارسی اور اردو میں لفظ بیمہ اس مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے " بیم" کے معنی خوف اور خطر کے ہیں " ہ " نسبت کے لئے بڑھادی گئی ہے، عراق والوں نے نے بیمہ سے تبییم، بنایا ہے جس کے معنی خوف اور خطرے سے بچانے کے ہوتے ہیں، اور بیمہ کو باب تفصیل میں لے جانے سے ازالہ کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح خداوند عالم فرماتا ہے ؛

اِلَّا مَا ذَكَّيْتُم (۵ : ۳)

"ذکاء" اصل میں خون کی طبعی اور غریزی حرارت کو کہتے ہیں اور خون بہانے کے بعد یہ حرارت جاتی رہتی ہے، "باب تفعیل تذکیہ" میں لیجانے کے بعد اس کے معنی حرارت غریزی کے ازالہ کے ہو گئے۔ اس بنا پر لفظ "تبییم" (ازالۂ خوف وخطر) کا تامین یا بیمہ کے لئے زبان عربی یا غیر عربی میں استعمال کرنا زیادہ بہتر اور مناسب ہے۔ اور دیگر مشترک المعنی الفاظ میں سے اشتباہ سے زیادہ محفوظ ہے۔ مال اور دولت، زندگی، اور بڑھاپا، یا کسی اور چیز کا بیمہ ہو جبکہ انسان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے انجام دہی سے عاجز اور بے لبس ہو جاتا ہے اس کو تامین کہتے ہیں۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ بیمہ کمپنیاں نہ تو آنے والے خطرات کو دفع کر سکتی ہیں اور نہ کسی شخص کا خوف اور ڈر کم کر سکتی ہیں اور نہ مقدر میں لکھی ہوئی تباہی کو روک سکتی ہیں۔ ان کمپنیوں کا کام صرف اتنا ہے کہ پیش آمدہ خطرات اور مقدرہ نقصانات کی تلافی بطور ضمانت اور کفالت عمومی کے کرتی رہیں، اسی طرح ان کی ممبری اور رکنیت بھی ایک امر اختیاری ہے، جو شخص ان میں سے کسی کمپنی کا رکن بننا چاہے اس کو سالانہ

یا ماہانہ ایک رقم مقررہ داخل کرنا پڑتی ہے۔ مقررہ رقم کی مقدار جسے
بیمہ کرانے والا کمپنی کے حوالہ کرتا ہے۔ اس کی مطلوبہ ضمانت کی نسبت
سے ہوا کرتی ہے، جب کمپنی بیمہ کرانے والے کو اس کے نقصان
کی تلافی کی ضمانت دیتی ہے تو وہ مالِ مجموعِ مشترک سے دیا کرتی ہے
اور یہ کمپنی اس رقم کو بیمہ کرانے والے کو بطور اعانت اور تلافی نقصان
کے اپنے قانون اور قاعدے کے مطابق دیتی ہے، نہ اس لئے کہ یہ
رقم بیمہ کرانے والے کی جمع کی ہوئی رقم کا نفع اور سود ہے، بلکہ یہ کمپنی
کے اصول اور قاعدے کے مطابق ایک قسم کی عائد کردہ اور مقررہ
اعانت اور کفالت عمومی ہے جسے وہ اپنے ہر رکن کے ساتھ روا رکھتی ہے
بیمہ کا فائدہ یا تو خود بیمہ کرانے والے ہی کو پہنچتا ہے اور یا پھر اس کے
مرنے کے بعد اس کے ورثہ کو۔ غرض کہ کمپنی کا ممبر کسی وقت بھی اپنے مجموع
مشترک رقم کے نفع سے مستفید ہو سکتا ہے۔

جب کسی انسان کو اس بات کا خطرہ ہو کہ مرنے کے بعد میرے
چھوٹے، نابالغ بچے، عاجز اور بوڑھے ماں، باپ، اور دوسرے اعزا
فاقہ کشی سے مرنے لگیں گے یا در بدر ٹھوکریں کھاتے پھریں گے تو ایسے

ممکنہ واقعات کی پیش بندی کے لئے زندگی کا بیمہ یقیناً اس قسم کے مصائب اور مشکلات سے بچنے کی آسان ترین شکل ہے، اور ایسی صورت میں بیمہ کرانے والے کے مرنے کے بعد اس کے بچوں کو کسی بھی مشکل سے دوچار نہ ہونا پڑے گا بلکہ مرنے کے بعد بیمہ شدہ رقم اور اس کے فوائد سے اسی کے بچے مستفید ہوں گے۔ خداوند عالم کے حکم کی تعمیل کی یہی ایک بہترین صورت ہے۔

ولیخش الذین لو ترکوا ذریۃ ضعافاً خافوا علیھم (۹:)	جو لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو فاقہ کشی کی حالت میں دانستہ چھوڑ کر مریں گے۔ وہ خدا کے خوف کے زیادہ مستحق ہیں۔

بلا شک و شبہ نظم آیت کریمہ نے (ولیخش) کو صلہ ذکر ہونے کے بعد مفعول سے بے پروا کر دیا ہے اور کسی چیز کا بجائے دو دفعہ کے ایک دفعہ اس طرح سے ذکر کرنا کہ مفہوم کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آجائے یقیناً انتہا درجہ کی بلاغت اور فصاحت ہے چنانچہ آیت میں صلہ؛ الذی لو ترک ذریۃ ضعافاً خاف علیھا لیخش من ان یترکھا ضعافاً۔

کے ذکر کرنے کے بعد مخاطب بڑی آسانی سے کلام کے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے۔ صلہ میں " لو " بطور شرطیہ کے استعمال ہوا کرتا ہے مثل، "ربما یود الذین کفروا لو کانو مسلمین" (۱۵: ۲)

قرآن میں ایسی مثالیں بہت سی ہیں جہاں صلہ نے فعل کو مفعول سے مستغنی اور بے پروا کر دیا ہے۔ جیسا،

"وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء" (۱۰: ۶۶)

آیت میں "یدعون" کے مفعول کے ذکر نے " وما یتبع " کے مفعول کے ذکر کرنے کی حاجت کو پورا کر دیا۔ اب اصل عبارت یوں ہو گی۔ " الذین یدعون من دون اللہ شرکاء، لا یتبعون شرکاء ان یتبعون الا الظن " جو لوگ خدا کے سوا دوسرے باطل معبودوں کی پوجا کرتے ہیں وہ حقیقتاً ان کی پوجا نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنے ظن باطل کی پیروی کرتے ہیں۔ دوسری مثال، " واوتیت من کل شیئ شیاء " ہر چیز میں سے ایک چیز دی گئی۔ تیسری مثال، " واتاکم من کل ما سئلتموہ " جو تم نے مانگا وہ تم کو دے دیا۔

یہاں پر بھی " اتاکم " کے مفعول کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ

اصل عبارت یوں ہے "واٰتاکم من کل ما سألتموہ کل ما سألتموہ"
ایک دوسرے طریقہ سے بھی آیت کا مفہوم عربی زبان میں ادا ہو سکتا ہے
"واٰتکم من کلٍ ما سألتموہ ما سألتموہ" دونوں صورتوں میں عموم مستغرق
ہے۔ لفظ "کل" دوسری صورت بہ نسبت اول (من کل شئی سالتموہ
اولم تسئلوہ) کے زیادہ عام ہے۔ اور شمولیت بھی اس کی زیادہ ہے
خداوند عالم کے کرم کے ساتھ یہی دوسری صورت زیادہ مناسب ہے
جیساکہ وہ خود فرماتا ہے کہ اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو تو یہ تمہارے
بس کی بات نہیں ہے اہل تفسیر کتاب اللہ کے نظم کی اصلاح کی خاطر اس
آیت میں خارجی مفعول فرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ جس طرح کتاب اللہ
کی دیگر آیات یا دوسری کتابوں کی اصلاح نظمی کی خاطر یہ حضرات اپنی
عادت اور معمول کے مطابق کرتے ہیں حالانکہ خدا کی کتاب اور اس کا
کمال اس قسم کی ہر اصلاح اور ہر عیب سے بری اور بالاتر ہے اس کی
ذات گرامی ہر مادی حاجت سے بری، اور بلند تر ہے۔ لیکن پھر بھی مفسرین
کرام اس قسم کی جرأتیں کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے معنی اگرچہ مفسرین کرام اور اولیاء عظام کے

بیان کی بنا پر بھی صحیح اور درست ہو سکتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہ فرضی اور تقدیری مداخلت کتاب اللہ تعالیٰ کے نظم اور سیاق بیان کو اپنی بہترین بلاغت اور فصاحت سے ہٹا دیتی ہے کیونکہ فرضی اور تقدیری مداخلت کی صورت میں ربط عبارت اور آیت کا نظم اپنے مفہوم اور مطلب کو اس خوبی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا جس طرح کہ وہ اس وقت موجودہ صورت میں ادا کر رہا ہے، حالانکہ آیت وراثت ہی کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اتاری گئی ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں میری گذارش ایک تسلیم شدہ امر ہے، اور یہ صرف میری ہی مخلصانہ جد و جہد اور کوشش کا نتیجہ ہے، جس میں نہ تو کتاب اللہ کے نظم کی اصلاح کا دعویٰ ہے اور نہ اس میں کسی فرضی اور تقدیری مداخلت کا جھگڑا ہے۔ میرے خیال سے تو کتاب اللہ کے ساتھ یہی برتاؤ ایک بہترین طریقہ ہے اور کتاب اللہ کی بلاغت اور فصاحت کو بحال رکھنے کے لئے یہی ایک سب سے زیادہ مناسب اور موافق راستہ ہے اس لئے کہ کتاب اللہ کا مقصد بھی اصل قانون الٰہی ہی کا بیان

کرنا ہے۔ اور چھوٹے اور ناتواں بچوں کی حالت ضعیف کی اہمیت جتانا ہے۔

اب یہ بات قابل غور رہ جاتی ہے کہ بیمہ کا جواز کس دلیل یا کس حجت سے ثابت ہے؟ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ عصر جدید اور دور حاضر میں بیمہ کمپنیاں تمام کی تمام ایک قسم کی کفالت عمومی کی شکل میں تقریباً ہر جگہ اور ہر شہر میں موجود ہیں اور ہر شخص کمپنی کی مخصوص اور مقررہ رقم کے ادائیگی کے بعد اس کا ممبر اور حصہ دار بن سکتا ہے اب یہ کہ وہ رقم زائد ہو یا کم تو اس سے ہم کو کوئی بحث نہیں ہے چونکہ رقم ایک قسم کی ضمانت مطلوب ہوتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ مختلف کمپنیوں میں اس کی حیثیت مختلف ہو تاہم مقصد سب کمپنیوں کا قریب قریب ایک ہی ہوا کرتا ہے۔ ان کمپنیوں کے شرعی جواز کے لئے تین دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں اور ان میں سے ہر حکم کی تعمیل ہر مسلمان پر شرعاً فرض ہے۔ قرآن، حدیث، اور اتباع صحابہ رضی اللہ عنہم کی رو سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ان کی تعمیل کرے، ان دلائل سے نہ صرف اس قسم کی کمپنیوں کی ایجاد اور اختراع ثابت ہوتی ہے بلکہ ان کی ایجاد کی

ضرورت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان اصولوں پر عمل کرانا بھی ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اور ان احکام پر مطلع ہونے کے بعد کسی مسلمان کی اس معاملہ میں کوتاہی اور غفلت یقیناً قابل مواخذہ ہے۔ سوسائٹی معاشرہ اور جماعت کی اصلاح کے لئے ان میں سے صرف ایک ہی دلیل کافی ہے چہ جائیکہ تین کی تلاش و جستجو کی جائے۔

۱۔ نصیحت:۔ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں

" الدین النصیحة، قیل لمن یا رسول اللہ، قال اللہ و لنبیه و لکتابه و لعامة المؤمنین "

دین دوسرے کی بھلائی ہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا کس کی خوشنودی یا کس کی پیروی کی خاطر آپ نے ارشاد فرمایا خدا، رسول، تمام مسلمانوں کی خوشنودی، اور بھلائی، اور خدا کی کتاب فرمانبرداری کی خاطر۔

نصیحت کے معنی ہیں دوسرے کی بھلائی چاہنا۔ رسول خدا نے اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بھی ارشاد فرمایا ہے۔ "أن تحب لا خیلک ما تحبه لنفسك"۔ اپنے مسلمان بھائی کیلئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔ قرآن میں بھی یہ لفظ مختلف جگہ استعمال ہوا ہے:۔

ونصحت لکم۔ میں نے تمہاری بھلائی چاہی۔ انی لکما لمن الناصحین۔ میں تم دونوں کی بھلائی چاہتا ہوں۔ نصیحت کے یہی معنی لینا یقیناً تقویٰ اور پرہیزگاری کی روح، عدل اور انصاف کی بنیاد ہے۔ اور یہی معنی لے کر مسلمان اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اور بہتر سے بہتر طریقہ پر رسول اللہ کے ارشاد گرامی کی تعمیل کر سکیں گے۔

۲۔ رعایت:۔ اس لفظ کے معنی ذمہ دار ہونے اور حفاظت کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن کریم نے بھی اس معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ "فمارعوھا حق رعایتھا" انہوں نے اس کی کوئی مناسب اور کما حقہ حفاظت نہ کی۔ شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔ "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کے ذمہ داروی کے متعلق پوچھا جائے گا۔ چنانچہ اس ارشاد محترم کی خاطر یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان اپنی ذمہ داریوں سے خود کو سبکدوش کرنے کے لئے اللہ کی مخلوق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔ اور اس پر

لازم ہے کہ دل کھول کر انسانیت اور بشریت کی خدمت کرے سوسائٹی اور معاشرہ کو خوش حال بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سرگرم کوشش میں مصروف رہے۔ گویا اس طرح لفظ رعایت کی عمومیت اور شمولیت بھی اتنی ہی وسیع ہے جتنی وسعت لاعموم کہ لفظ نصیحت میں تھی۔ اس طرح سے گویا دونوں لفظ از روئے اہمیت مساوی قرار پائے۔

تیسری دلیل کفالت:- اس لفظ کفالت کے معنی تاوان اور ضمانت مطلوب کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس لفظ کفالت کا بھی متعدد جگہ تذکرہ ہے۔ "کفلہا زکریا" وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا" حضرت ذکریا (علیہ السلام) حضرت مریم (علیہا السلام) کے کفیل تھے۔ اور تم نے خدا کو اپنا نگران بنایا۔ کفالت کی دو قسمیں ہیں۔ خاص اور عام دوسری قسم سے سبکدوش ہونا ہر مسلمان اور ہر فرد مومن کا فرض ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ سوسائٹی اور معاشرہ کی بھلائی کی خاطر اپنے آپ کو اس فرض سے بری کر دے۔ تکافل عمومی اپنے منافع اور مفاد عامہ کی خاطر ایک بہترین اصل ہے۔ اور شرع اسلام میں اس کی کمترین مثال:- "اماطۃ الاذی عن الطریق" ہے۔ راستہ سے کوڑے کرکٹ اور کانٹے

کو دُور کرنا اسی کے معنی ہیں۔ اور ارشادِ خداوندی؛ تعاونوا علی البر و التقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ۔ اللہ کی خوشنودی اور لوگوں کی بھلائی کی خاطر خدا کی مخلوق کی رضامندی کے معاملہ میں ایک دوسرے کی اعانت اور امداد کرو۔ اور دوسروں کے ظلم و ستم کی حالت میں ایک دوسرے کا ساتھ مت دو۔ اسلام کی آمد سے پہلے بھی عرب میں "دِلاء"؛ تعالف، اجارہ، اور دیت جاہلیت کے زمانے میں کفالت عمومی کی شکل میں موجود تھے۔ اور تکافل عمومی کی صورت میں ان پر عمل ہوتا تھا۔ اسلام کے آنے سے پہلے بھی یہ چیزیں تمام کی تمام عملی شکل میں موجود تھیں۔ اگر کوئی شخص دوسرے کو قتل کرتا تو مقتول کی دیت پہلے قاتل ہی پر لازم آتی تھی جس میں قاتل کا قبیلہ بھی مقتول کی دیت کی ادائیگی میں شریک ہوتا تھا۔ قاتل کے قبیلہ پر مقتول کی دیت قانون تعاون اور تکافل ہی کی بنا پر لازم آتی تھی۔ دیت کی ادائیگی یا تو ایک سو اونٹ، یا ایک ہزار سونے کے دینار اور یا دس ہزار چاندی کے درہم کی رقم کی صورت میں ہوا کرتی تھی اسلام کے آنے کے بعد کتاب اللہ اور نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دیت کے لئے جاہلیت کے زمانے کے

اسی مروجہ اجتماعی قانون کو بحال رکھا اور اس کو قانون خداوندی قرار دے کر زیادہ سے زیادہ پختہ اور مستحکم کر دیا۔ اگر جاہلیت کے زمانے میں دیت کی ادائیگی صرف قاتل کے قبیلہ ہی پر لازم آیا کرتی تھی تو اب تمام اہل اسلام کے "بیت المال" سے اس کی ادائیگی ہونے لگی گویا اس قانون کو زیادہ سے زیادہ رواج دینے میں جو بھی آسانیاں ممکن ہو سکتی تھیں ان سب کو مہیا کیا گیا، کفالت عمومی کو جتنی وسعت دی جا سکتی ہے اتنی وسعت دی گئی۔ اگر سچ پوچھا جائے تو اس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی قانون عمومی یا کوئی کفالت عامہ اتنی وسعت پا سکے۔

خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی دفاتر اور دواوین کی تدوین اور ترتیب کے بعد دیت کی ادائیگی کو بیت المال ہی پر لازم کر دیا تھا چنانچہ اہل دیوان اور دفتر سینکڑوں قبائل سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی اس معاملہ میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ حالانکہ اس سے قبل دیت صرف قاتل اور اس کے قبیلہ ہی پر لازم آتی تھی۔ لیکن اسلام نے اس کفالت عمومی کو اتنی وسعت دی کہ ہزار قبائل کو اس سلسلہ میں ایک دوسرے کا شریک بنا دیا۔ پھر حضرت عمر

کا یہ حکم تمام صحابہ کرام رضؓ کے روبرو اور سب کے سامنے تھا، اور ان کی موجودگی میں اس پر عمل درآمد کرایا گیا، لیکن چونکہ اس کی بنیاد نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضع کردہ اور مقرر کردہ سنت پر تھی۔ اس لئے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہ کی۔ اور پھر ایک قسم کی کفالت عمومی ہی تو تھی تو اس کی مخالفت کیونکر کی جاتی تھی ؟۔

امام الائمہ اور شمس الائمہ مبسوط (۲۷ : ۱۲۵) میں ارشاد فرماتے ہیں ؛ " اہل علم نے دیت کی ادائیگی کو اہل دیوان ہی پر لازم کر دیا ہے "
آج بھی اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی بھلائی اور اپنی اقتصادی حالت کی بہتری اور سدھار کی خاطر مختلف طریقوں سے اس نظام اسلامی کو زندہ کریں۔ موجودہ افلاس، تنگدستی اور احتیاج کی وجہ سے ہر لکھے پڑھے مسلمان کا اولین فرض ہے کہ وہ اس مسئلہ پر پہلی فرصت میں غور کرے۔ تاکہ مسلمانوں کے تعاون سے کفالت عمومی ضرورت کے وقت ایک منظم شکل میں منظر عام پر آجائے۔ آج ہمارے مساجد کے امام مدارس دینیہ اور دینویہ کے اساتذہ اور طلباء کو اس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، ہم کو اس سلسلہ میں اب مزید غفلت نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ہم

اس کے بعد بھی خواب غفلت میں پڑے رہے تو انجام بہت ہی برا ہو گا۔

اٹھو و گرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ بیمہ کمپنی کا رکن یا ممبر بننا ایک اختیاری بات ہے اور کسی تباہی کے وقت جو رقم کمپنی بیمہ کرانے والے کو دیتی ہے وہ ایک قسم کی کفالت عمومی اور اعانت عامہ ہوا کرتی ہے۔ اور یہ رقم بیمہ کرانے والے کی جمع کردہ رقم کا نفع نہیں ہوتا۔ کمپنی جب تمام سرمایہ اور سب مال مجموعی مشترک رقم کو کسی مفید کام میں لگاتی ہے یا اس رقم سے تجارتی کاروبار کرتی ہے تو اس قسم کی تجارت یقیناً مضاربتِ مشروع ہی کی ایک شاخ ہوا کرتی ہے۔ اس قسم کی تجارت کے منافع بھی مضاربت ہی کے منافع کی طرح ہوتے ہیں جن کی صحت اور جواز میں کسی کو شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی یہ نہ تو قرآن کریم کا حرام کردہ ربا اور سود ہے، اور نہ یہ رقم بیمہ کرانے والے کی رقم کا نفع ہے بلکہ یہ ایک قسم کی اعانت ہے جس کے ذریعہ متوقعہ اور واقع ہونے والی تباہی کی انسداد اور پیش بندی مقصود ہوتی ہے۔ نہ معلوم بعض حضرات بے سوچے سمجھے اس کو سودی کاروبار کیسے کہہ دیتے ہیں ۔

ذرا خیال تو فرمائیے ہم فرض کرتے ہیں، آج ایک شخص پانچ روپیہ ماہانہ کے حساب سے دو ہزار کی رقم کے واسطے اپنی زندگی کا بیمہ کراتا ہے۔ اور بیمہ کے تمام مراحل طے ہو جانے کے دوسرے روز وہ مر جاتا ہے۔ شرکت یا کمپنی دو ہزار روپے کی رقم اس کے وارثوں کو ادا کرتی ہے اب یہ بتایا جائے کہ یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ یہ دو ہزار کی رقم اس کے پانچ روپیہ کے ایک دن کا نفع یا سود ہے اب جبکہ ہمارا مندرجہ بالا بیان صحیح قرار پایا تو، خدا کا فضل اگر شامل حال رہے تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس لئے اب ہم کو یہ کہنے میں ذرا بھی خوف اور خدشہ نہیں کہ بیمہ اور انشورنس یقیناً موجودہ زمانے میں مفاد عامہ کے لئے ایک بہترین چیز ہے، اور اس کی بہتری اور اچھائی میں کسی فقیہ اور عقلمند کو شک کرنا بظاہر ناممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر کوئی بزرگ اس امر کی حقانیت اور صداقت سے انکار فرماتے ہیں اور امت مرحومہ کے حق میں اسکی بھلائی سے روگردانی کرتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ایسے لوگوں سے شریفانہ طریقہ سے درگزر کریں، اور ان کی ہٹ دھرمی کے اعتراضات کو خندہ پیشانی سے سن لیں، اگر اسلامی حکومتیں

اور مسلمان سرمایہ دار مل کر ایک بڑی رقم کا بیمہ کرائیں یا اسلامی سلطنتیں
اپنی رعایا کے ہر فرد پر زندگی یا دیگر اموال کے بیمہ کو بیمہ کمپنیوں کے
اصول کے مطابق واجب اور لازم کر دیں تو ایسا کرنا یا کرانا یقیناً ان
حکومتوں اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہوگا، اگر دولتمند اور سرمایہ دار
مسلمان اپنے اموال کے ایک مخصوص حصہ کو بصورت بیمہ وقف کرائیں
تو یہ وقف اپنی برکت اور فائدہ مندی کی وجہ سے یقیناً مفید ترین وقف
ہوگا، اور ایسے وقف کرنے والے کا شمار بہترین اور ممتاز ترین واقفین
میں ہوگا، (آج ہر جگہ کے مسلمان جس غربت اور افلاس میں مبتلا ہیں
وہ کسی صاحب دیدہ سے پوشیدہ نہیں ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ
مسلمان اس راہ میں جلد سے جلد عملی قدم اٹھائیں)

آج کل بیمہ کمپنیوں سے فائدہ اٹھانا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایسا
کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے کسی عقلمند اور دُور اندیش فقیہ کا اس سے انکار
کرنا میرے خیال سے تو ناممکن ہے۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ
بیمہ ہی وہ بہترین طریقہ اور آسان ترین صورت ہے جس کے ذریعہ
آیت مذکور (ولیخش الذین لو ترکوا) پر عمل ہو سکتا ہے۔ اور

صرف اسی طریقہ سے اس آیت کو بہترین عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے لیکن میرے اس کہنے کا مقصد دوسرے اہل تفسیر کے ارشادات کا رد بھی نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ ایک طریقہ مزید فائدہ حاصل کرنے کا بتانا مقصود ہے اگر مفسرین کرام کی تفسیرات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو میری گذارش اور میرا بیان کردہ طریقہ بھی یقیناً زیادہ سے زیادہ قابل عمل اور فائدہ مند ہے

جس زمانے میں بصرہ میں مقیم تھا تو حضرت سید محمد ذکیر صاحب جن کا گھر "بیت ذکیر" کے نام سے مشہور ہے۔ اور بصرہ کے بزرگ ترین اور شریف ترین لوگوں، علم دوست، اور مہمان نوازوں میں ان کا شمار ہے ان حضرت کے یہاں اکثر میری آمد ورفت رہتی تھی، ایک دن بھرے مجمع میں میرے اور صاحب خانہ کے درمیان بیمہ کے متعلق بحث ہو رہی تھی۔ صاحب خانہ یعنی حضرت محمد ذکیر صاحب نے فرمایا، "ہم اپنے اموال اور زندگی کی تبیمم ڈیڑھ فی صدی پر نہیں کرانا چاہتے ہیں، کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں ½۲ فیصدی سے زیادہ پر اس کا بیمہ کرا چکے ہیں" یہ سب سے پہلا اتفاق تھا جب کہ میں نے لفظ بتیمم ایک عرب ادیب کی زبان سے

سُنا، سید محمد ذکیر صاحب کی زبان سے یہ کلمات سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اس لئے کہ زکوٰۃ دینوی اور اخروی معاملات کے لئے انسان کے نفس اور مال دونوں کے لئے بہترین بھلائی ہے، اور مؤمن کے مال اور نفس کے واسطے مفید ترین گارنٹی اور ضمانت ہے، جو سوسائٹی اور معاشرہ کے اقتصادی نقصانات کی تلافی کر دیتی ہے، اس گفتگو سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اور کیوں نہ ہوتی جبکہ انہوں نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جو میرے دل کو بھاتی تھی، ایسی صورت میں مجھے لازماً خوش ہونا چاہیئے تھا۔

اس کے بعد پھر کسی روز ایک علمی مجلس میں بیمہ کا ذکر چھڑ گیا، اہل مجلس نے میری رائے معلوم کرنی چاہی؛ میں نے متذکرہ بالا خیالات کو ظاہر کیا چنانچہ اہل مجلس میں سے ایک فقیہ صاحب نے مبالغہ آمیز الفاظ میں میرے خیالات کو پسند کیا اور مجمع میں سے ایک نوجوان نے بھی خواہش کی کہ میں اپنے اس بیان کو قلم بند کر کے ان کے حوالہ کر دوں، میں نے بھی ان کی یہ خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا، اور اپنے خیالات چند صفحوں پر لکھ کر ان کے حوالہ کر دے۔

چند روز بعد ایک مختصر رسالہ انگریزی زبان میں چھپا ہوا میری

نظر سے گذرا، جس کو کسی مسلمان نے بیمہ اور بنک کے سودی کاروبار کے متعلق نقل کیا تھا۔ رسالہ کا مضمون یہ تھا کہ حضرت محترم شاہ عبد العزیز صاحب مرحوم دہلوی نے بیمہ اور بنک کے سود کو دار الحرب میں جائز قرار دیا ہے۔ اور رسالہ والے صاحب نے کتب فقہیہ میں فقہا کا مشہور مقولہ "لا ربی بین مسلم و حربی فی دارہ" کو بھی نقل کیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا، ذرا دیکھیے تو؛

(۱) اس قسم کے رسائل ایک ایسی قوم کی زبان میں نشر ہوتے ہیں جس کا تمدن اپنی انتہا پر پہنچ چکا ہے۔

(۲) فقہ اسلام سے ایسے جملے نقل کئے جاتے ہیں جن کے مفہوم اور معنی کو نقل کرنے والا خود بھی نہیں جانتا ہے۔

(۳) پھر یہ اقوال ان برگزیدہ ائمہ کرام کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جن کی ذات گرامی قطعاً ایسی نسبتوں سے پاک ہے۔

(۴) اس کے علاوہ علمار ہند ان تمام حالات اور ان واقعات کو دیکھتے ہوئے بھی خاموش رہتے ہیں ؟

کتنی تعجب خیز ہے یہ حقیقت! اور اس سے بڑھ کر تعجب خیز ہمارا

سکوت اور خاموشی۔ ان حالات اور ان واقعات سے متاثر ہو کر میں نے ان چند اوراق کو جو بصرہ میں اس نوجوان کے حوالہ کئے تھے چھاپنے کا ارادہ کیا، اس امید پر کہ شاید اس کے ذریعہ وہ عام اشتباہ دُور ہو جائے، جو فاسد افکار و غلط اوہام کی شکل میں بڑے بڑے فقہا کے دماغوں میں جاگزیں ہو کر گھونسلہ بنا چکا ہے۔ اور اچھے اچھے عقلمندوں کے دماغی توازن کو بھی تباہ کر چکا ہے، خدا کرے میری یہ آرزو پوری ہو جائے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ لڑائی چھڑ جانے کے بعد مسلم اور غیر مسلم دونوں کے خون، مال، اور تمام حقوق کی عصمت اور حفاظت بالکل جاتی رہتی ہے، اور کسی کے مال و دولت کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان دونوں میں سے خواہ کوئی بھی ہو جب دار الحرب اور میدان جنگ میں پہنچے گا، تو نہ تو اس کے نفس کی کوئی گارنٹی اور ضمانت دے سکتا ہے، اور نہ اس کے مال اور دولت کی۔ بلکہ جس طرح بھی کسی سے ہو سکے گا وہ دوسرے کو لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ پس عدم ربا تا اختتام حرب ہے نہ یہ کہ ربا حلال ہے۔ بلکہ اصلی علت اور حقیقی سبب یہ ہے کہ مسلمان

اور غیر مسلم دونوں کے خون، مال، اور تمام حقوق کی عصمت اور حفاظت
جاتی رہی ہے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی کسی چیز کا مالک نہیں رہا ہے بلکہ
مسلم اور غیر مسلم دونوں کو اس بات کی عام اجازت ہے کہ وہ اپنے مخالف
کا مال جتنا، اور جیسے لینا چاہے لے سکتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی
ہے جیسے کہ ہمارے فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ "لاربی بین الوالد
وولدہ" یعنی باپ اور بیٹے کے درمیان ربا اور سود متحقق نہیں ہو
سکتا۔ یا، "لاربی بین الرجل واہلہ" یعنی شوہر اور بیوی کے
درمیان ربا اور سود نہیں ہے" ہمارے فقہاء کے ان اقوال سے حلت
ربا ثابت نہیں ہو سکتی ہے بلکہ ان کا یہ ارشاد عدم ربا کا فائدہ دیتا ہے۔ اور
ان کے اس کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے درمیان ربا اور سود کا
متحقق اور ثابت ہونا غیر متصور اور ناممکن ہے۔ اس لئے کہ والد کو
والد ہونے کی وجہ سے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طرح اور جتنا
چاہے اپنے لڑکے کے مال سے صرف کرے، یہ مقصد نہیں کہ وہ
خرید اور فروخت کے ذریعہ ایسا کر سکتا ہے۔ بعض اوقات بعض فقہاء
اپنے وہم اور ظن کی بنا پر بطور مغالطہ کے یہ بات دلیل اور حجت کی طرح

پیش کرتے ہیں اور اس کو سنت اور حدیث کی طرف بطور سند کے منسوب کرتے ہیں :-

(۱) حضرت مکحول رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "لا ربٰی بین المسلمین واھل الحرب فی دار الحرب" یعنی مسلمانوں اور ان سے لڑنے والوں کے درمیان میدان جنگ میں ربا اور سود نہیں ہے "

روایت میں حضرت مکحولؓ کا درجہ ایک ثقہ امام کا ہے، اور اس کے علاوہ آپ کا مرسل بھی محدثین کے نزدیک مقبول ہی، اگر کوئی شخص مسلمان اہل الحرب سے مال لے تو یہ اس کا کام ہے، اور ایسا کرنا اس کے اختیار میں ہے اس کے ایسا کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ شرع اسلام نے ربا، قمار، اور جوے کو حلال قرار دیا ہے۔ بلکہ جنگ نے مال کی عصمت اور حفاظت کو باطل کر دیا ہے اور اب مال بجائے معصوم اور محفوظ ہونے کے مباح قرار پایا ہے۔ اور اب مسلمان جس مال پر قبضہ کرتا ہے وہ مباح ہے۔ پس شرع اسلام مال مباح کا واپس کرنا مسلمان پر

واجب نہیں کرتا۔ صرف استیلا اور غلبہ ملکیت کے لئے کافی نہیں بلکہ ساتھی مسلمان کے لئے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس مال پر قبضہ کر کے اپنے دار، دارالاسلام کو منتقل بھی کر دے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مال کی حفاظت صرف دار ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ صدیق نے مخاطرت کی، اور آپ نے شرط لگائی۔ پھر مخاطرت اور شرط کی مدت میں نبی محترم کے حکم سے اضافہ کرایا، روم نے فارس پر غلبہ پایا، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرط جیت لی۔ اور اپنا مشروط لے لیا۔ حضرت شارع اسلامؐ نے اس کی اجازت دیدی، اگرچہ جوابازی اور قماربازی اسلام میں حرام تھے۔ حضرت شارع اسلام کی اجازت دینے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ پہلی حجت تھی جس کی وجہ سے کتاب اللہ کی صداقت اس کے منکرین پر ثابت ہوگئی۔

(۳) اس کی وجہ سے اسلام کا غلبہ اس کے دشمنوں پر ثابت ہوگیا

(۴) اس وقت تک مکہ شریف دارِ شرک تھا۔

(۵) حضرت صدیق کا ایسا کرنا نہ تو مخاطرت تھی، نہ شرط، اور نہ جوابازی تھی۔ بلکہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ روم فارس پر غلبہ پائیگا۔

اس لئے حضرت صدیق کا عمل نہ تو جوابازی قرار پاسکتا ہے اور نہ قمار۔
نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ سے اس شرط پر کُشتی لڑی
تھی کہ اگر میں نے تم کو پچھاڑا تو تمہاری بکریوں کی ایک تہائی میری
ہو جائیں گی، چنانچہ آپ نے تین مرتبہ رُکانہ کو پچھاڑ کر اس کی تمام
بکریاں جیت لیں، لیکن شرافت نفس کا ثبوت دیتے ہوئے آپ
نے اس کی تمام بکریاں اسے واپس کر دیں رکانہ اس وقت تک کافر
تھا۔ نہ تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی تھی، اور نہ اسلام
سے جنگ ۔ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام کسی مسلمان
کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ کسی کے مال کو بُری نگاہ سے
دیکھے، بلکہ کافر اور مسلمان دونوں کے مال کی عِصمت اور حفاظت برابر
تھی، جس طرح ایک مسلمان کے مال کی حفاظت ہوا کرتی تھی اسی طرح
کافر کے مال کی نگہبانی ہوتی تھی ۔

(۷) غزوۂ احد کے موقعہ پر کسی مشرک مقتول کی نعش خندق
میں گر پڑی، اس کے حاصِل کرنے کے لئے ایک معتدبہ رقم فدیہ پیش
کی گئی، حضور محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو اس رقم کے لینے

سے منع فرمایا اور نعش بلا فدیہ ورثہ کے حوالہ کردی اہل عراق کا یہ مقولہ کہ "کفار کا خون اور مال ہمارے لئے حلال ہے" اسلام سے روگردانی نہیں بلکہ یہ ایک قسم کا سیاسی جملہ ہے جو جانبازان اسلام کو رغبت دلانے کے لئے معرکۂ جنگ کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ اس کے فائدے کا احساس صرف زمانۂ جنگ ہی میں کیا جا سکتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ کیا دار الحرب میں مسلمان اور غیر مسلم حربی کے درمیان ربا اور سود جائز ہے؟ آپ نے فرمایا۔ "کیا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہے؟" سائل نے کہا "نہیں" امام مالکؒ نے فرمایا "پھر تو کوئی حرج نہیں ہے" (کتاب مدونہ ج ۳ صـ۲۸۱) اور اگر معاہدہ ہو گیا تو ایسی صورت میں جنگ باقی نہیں رہے گی اور اب اس وقت میں مال کا سود کے ساتھ لینا یا دینا جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مسلمان کا تعلق دار الاسلام سے ہوگا اور اہل اسلام کہیں بھی ہوں ان کے لئے سود کا لین دین ناجائز ہے۔ یہ بات کسی فقیہہ کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ مسلمان کے لئے کافر کے مال کو سود کے ساتھ لینے کو اس کی رضامندی اور خوشی پر محمول کرے، کیونکہ اس نے

یہ مال مع ربا حکم عقد کی بنا پر لیا ہے۔ یعنی عام خرید و فروخت کی طرح یہ معاملہ بھی اضافہ سود کے ساتھ طے قرار پایا ہے، اسی وجہ سے سود دینے والا سود دینے پر مجبور رہے، بصورت دیگر اگر حکم عقد کی صورت نہ ہوتی، تو کافر مسلمان کے ایسے فعل پر نہ تو کبھی رضامند ہوتا اور نہ اس بات پر آمادگی کا اظہار کرتا، اگر مسلمان کے اس فعل کو دارالحرب میں اس تاویل کے ساتھ جائز قرار دیا جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس عمل کو دارالاسلام میں بھی اسی تاویل کے ساتھ جائز قرار نہ دیا جائے وہاں بھی ہم یہی کہہ سکیں گے کہ دارالاسلام میں بھی ایک درہم کو تو درہم کے بدلہ میں دے دیا گیا لیکن دوسرا درہم مسلمان نے بطور ہبہ کے اپنی خوشی اور رضامندی سے دیا ہے ـــ کتب مذہبیہ کے بیان کے مطابق دین اور قانون کے اعتبار سے دار صرف دو ہیں :ـ

(۱) دارالاسلام اور (۲) دار غیر اسلام۔ اسلام کے مقابلہ میں تمام ادیان ایک دین اور ایک ملت مانے جاتے ہے، جن کو دار کفر اور دار شرک سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فقہائے کرام کے نزدیک دار صرف دو ہیں (۱) دارالاسلام (۲) دارالشرک یا دارالکفر۔ لیکن

یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر ہونے کی وجہ سے اسلام کا عدل اور انصاف نہیں بدلتا، اور نہ اُس کے انصاف پر اس اختلاف دارین کی وجہ سے کوئی اثر پڑتا ہے۔ مسلم اور غیر مسلم دارالاسلام میں ہوں، یا دار کفر میں، ان دونوں کا خون، مال، اور تمام حقوق ہر حالت میں صرف انسانیت کی بنا پر معصوم اور محفوظ ہیں۔ گویا ان کے خون اور مال کی حفاظت کلمہ اور دار کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلام کے عدل اور انصاف کی بنا پر ہے۔

دار کا اختلاف یا تو طبعی ہوتا ہے یا جنسیات اُمم اور حکومت کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن ان میں سے ایک بھی اسلام کے عدل اور انصاف پر اثر انداز نہیں، بلکہ اسلام کی نگاہ میں ہر امت، ہر قوم اور ہر دار کے لیے عصمت اور امان موجود ہے، اور یہ امن و انصاف نفس انسانیت کی بنا پر ہے، دین اور کلمہ کی وجہ سے اس کا ثبوت نہیں۔ اسی وجہ سے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے؛

وَاللّٰہُ یَدْعُوا اِلٰی دَارِالسَّلَامِ۔ خدا اسلامتی کے گھر کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃً (۲:۲۰۸)

ایمان والو! تم سب کے سب امن میں داخل ہو جاؤ۔

عرش عزت، اور کرسئ عدل و انصاف کی طرف سے یہ ایک عام آسمانی خطاب ہے، جو زمین پر بسنے والے ہر فرد و بشر کے لئے ایک طرح کی خوشخبری ہے۔

خداوند دوجہاں کا قول: "اِنَّ الدِین عِندَاللہ الاسلام" خدا کے نزدیک برگزیدہ دین صرف اسلام ہی ہے۔ کے یہی معنی ہے کہ ہر فرد و بشر صلح و آشتی، امن و سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے انسان کا کوئی فرد دوسرے پر نہ تو زیادتی کرسکے، نہ اس کی آبرو ریزی کرے نہ شرف انسانی، حرمت بشری، اور عصمت کو نقصان پہنچا سکے۔

"وَاِن جَنَحُوا للسلم فاجنح لھا" اگر وہ لوگ صلح پر آمادہ ہوں تو آپ بھی ان سے صلح کر لیجئے۔ تمام روئے زمین عدلِ اسلام اور اس کی عزت کے حکم میں دار واحد قرار پاتا ہے، نہ تو اس میں اختلاف ادیان کا کوئی اثر ہوتا ہے، نہ جنسیات اُمم اس میں کوئی تغیر اور تبدل کر سکتے ہیں بلکہ ہر فرد و بشر عصمت دم، و عصمت مال، اور تمام انسانی حقوق میں

ایک مسلمان کی طرح ہی ہے، یہی فتویٰ اسلام ہے یہی اس کا بین الاقوامی معاملاتی، معاشرتی بے مثل قانون ہے اسلام کا فتویٰ اپنے احکام اور قوانین کے متعلق بالکل عام، اجتماعی، اور بین الاقوامی ہے اگرچہ اسلام کے قضیات اور قوانین کا نفاذ صرف دولت اسلام اور حکومت اسلامی تک ہی محدود ہے۔

نہ تو ایک دار دوسرے کے لئے دار حرب قرار پا سکتا ہے اور نہ ایک ملت اور قوم دوسری قوم کے لئے محارب قرار پا سکتی ہے جب تک یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے امن و امان کی فضا کو جنگ کے شعلوں میں نہ بدل ڈالیں، آج کل کی لڑائیوں میں ہر شخص کے سامنے یہ بالکل ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور ہر شخص بڑی آسانی سے اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ موجودہ جنگ (۳۹ تا ۱۹۴۵) کے زمانے میں کسی شخص کی جان و مال اور تمام حقوق کی کوئی بھی عصمت اور حفاظت باقی نہ رہی تھی۔ یہی وہ حقیقی جنگ ہے جس کی بنا پر ایک ملک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو کر دار الحرب کی بنیاد قایم کرتا ہے اور امن عالم کو تباہ کرتا ہے۔ اکثر حضرات

بلکہ بعض ائمہ کرامؒ (مثل امام محمد بن حزمؒ اپنی کتاب: "الاحکام فی أصول الاحکام" (ج ۸ ص ۱۲۹) کے نزدیک تو دار الحرب اور دار الکفر میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ یہاں تک ان حضرات کے نزدیک اس امین کافر (جو تیرے حقوق کو بھی اپنے ہی حقوق کا درجہ دیتا ہو، نہ تجھ پر زیادتی کرتا ہو، اور نہ تیرے حقوق کی عصمت دری کرتا ہو، اور نہ تجھ پر زیادتی پسند کرتا ہو) اور اس صریح کھلے دشمن کا میں فرق نہیں، جو اس وقت تجھ سے برسرپیکار ہو اور تیرے حقوق کی ذرا بھی رعایت نہ کرتا ہو، بلکہ تمہارے مال کو ہر طرح اپنے لئے حلال اور مباح خیال کرتا ہو، اور تمہارے خون کا دل سے پیاسا ہو۔ لیکن ایسے خیالات کا اظہار یقیناً مذہبی کور چشمی ہونے کے علاوہ ایک عبرتناک دینی گمراہی بھی ہے، کسی کاروبار کو دار الحرب میں حلال قرار دینا وہم اور خام خیالی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اس قول کے قائل نے بلاشک وشبہ فقہاءؒ کے اس قول: "لا ربا بین مسلم دخل دار الحرب وبین حربی فی دارہ" کا ذرا بھی مطلب اور مفہوم نہیں سمجھا ہے، اس لئے کہ مسلمان جس مال پر قبضہ کرتا ہے یا وہ مال

جس کو وہ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے یا اعلان جنگ کی وجہ سے اس کی حرمت اور عصمت جاتی رہی ہے، اب اس کو ربا کہنا بالکل لغو اور بے بنیاد ہے، بلکہ یہ تو ایسے مال پر قبضہ ہو رہا ہے جس کو اعلان جنگ نے مباح کر دیا ہے، چنانچہ اب مسلمان کا بھی اس پر قبضہ کرنا مباح ہی ہے؛ ـ

بعض حضرات ان ہی خیالات کو حضرت امام شاہ عبدالعزیز صاحب کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں، حالانکہ حضرت شاہ صاحب کو ان اوہام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے؛ جو شخص دار کفر اور دار حرب میں فرق نہیں کرتا ہے، یا حربی اور امین میں امتیاز نہیں کرتا ہے، اس کے اصولی، علمی، اور بنیادی خیالات صرف جہالت اور اسلام سے عبرتناک تغافل ہی نہیں بلکہ نہایت درجہ مضحکہ خیز اور تعجب انگیز بھی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس کے بالکل برعکس اسلام کا عدل اور انصاف قانونِ اسلام کے رو سے یہ ہے کہ کافر کا مال دار الکفر اور دار الاسلام میں اسی طرح محفوظ اور محترم ہے جس طرح ایک مسلمان کا مال، خون، اور تمام حقوق قابل حرمت اور عصمت ہیں ـ

اس بات کو ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ حقوق کی عصمت اور حرمت عدلِ اسلام کے روسے نفس انسانیت کی وجہ سے ثابت ہوتی ہے، دار، کلمہ، اور دین کے سبب سے ان کی حرمت اور عصمت متحقق نہیں ہوتی، جو شخص ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر اس میں غیر اقوام کے بینکوں کے سودی کاروبار اور ربائی عمل کو حلال اور جائز قرار دیتا ہے اس پر، "نادان دوست سے عقلمند دشمن اچھا ہے" والی مثل صادق آتی ہے، اس لئے کہ اس قول کی موجودگی میں ہندوستان کے مسلمانوں کا اپنے وطن، اور اپنے گھر میں ہونے کے باوجود ان کے مال، خون، اور تمام حقوق کی عصمت اور حفاظت جاتی رہتی ہے، اب نہ تو ہندوستان میں کسی مسلمان کا خون محفوظ رہتا ہے اور نہ گھر، اور نہ بنک میں ان کے مال کی حرمت باقی رہتی ہے۔

اب اس بے چارے جان بوجھ کر فقیہ بنتے والے کی مثال اس ریچھ کی سی ہے جس نے اپنے دوست کو مکھیوں کی تکلیف سے بچانے کی خاطر اس کے سر پر بھاری پتھر پھینک کر ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا ——————

تھوڑی دیر کے لئے کہنے والے کے قول کے مطابق ہم ہندوستان کو دارحرب ہی فرض کر لیتے ہیں۔ لیکن ذرا یہ تو بتایا جائے کہ کس کے مقابلہ پر ہندوستان کو دارحرب قرار دیا جائے ؟۔ آیا خود ہندوستانیوں ہی کے مقابلہ پر ؟ یا بیرون اقوام یورپ اور ان کے بنکوں کے مقابلہ پر ؟ ہر صورت میں نتیجہ وہی ہے کہ کسی ایک شکل میں بھی مسلمان کے جان و مال کی حُرمت اور عصمت باقی نہیں رہتی ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مال بنک والوں کی ملکیت قرار پا جاتا ہے۔ مسلمان نہ تو ربا اور سود کا مطالبہ کر سکتا ہے اور نہ راس المال اور سرمایہ کو طلب کر سکتا ہے چنانچہ ایسی صورت میں مسلمان اپنے تمام حقوق سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق حضرت امام اعظم شاہ ولی اللہ صاحب محترم حضرت امام شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت محترم مولینا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی آرا بعد میں آنے والے علمائے کرام سے مختلف تھیں، ان تین حضرات ائمہ مجتہدینِ عظام میں سے ایک بھی اپنے دین اور اپنے نفقہ کے ذریعہ حیلہ کی جستجو نہیں کرتا تھا،

چہ جائیکہ یہ حضرات ہندوستان میں بنک کے سودی کاروبار کو جائز قرار دیتے، بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اس بات کا علم تھا کہ شارع اسلام علیہ السلام جب بھی کسی سے معاہدہ کرتے تھے تو معاہدہ کرنے والے سے اس بات کو تسلیم کراتے تھے کہ وہ کبھی کسی سودی کاروبار یا ربائی عمل سے سروکار نہیں رکھے گا۔ جس طرح کہ قرآن کریم بھی صاف الفاظ میں اس کا اعلان کرتا ہے؛

"فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ" اگر تم سودی کاروبار کو نہیں چھوڑو گے تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کا اعلان کرو۔

اگر میں گمراہی پر ہوں تو یہ میری گمراہی یقیناً میرے ہی سر ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی فقیہ رہبر غیرت اسلام ہی کی بناپر میری رہبری کریگا، میں تہہ دل سے اس کا ممنون ہونگا، خداوند عالم کی طرف کسی سچی بات کو منسوب کرنا میرا شیوہ اور فرض ہونا چاہیئے۔ فقط

موسیٰ جار اللہ غفر لہ

مترجم خادم مطیع اللہ افغانی

بھوپال

لطیفی پبلشنگ ہاؤس لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی

کی نادر مطبوعات

دینیات یہ بلند پایہ کتاب مشہور علمار اسلام کے بصیرت افروز مضامین کا مجموعہ ہے جنکو پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے لیکن ایک کثیر تعداد اس مقدس دین کی حقانیت، سچائی اور فلسفہ سے ناواقف ہے۔ علمار نے انفرادی طور پر، یوں مذہب اسلام پر بیشمار کتابیں لکھی ہیں لیکن یہ خوبی صرف ہماری کتاب دینیات ہی کو حاصل ہے کہ اسمیں یکجائی طور پر اسلام کے اُن مشہور و جید علمار کے مضامین شامل ہیں جن کے تبحر علمی کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے۔ یہ کتاب نہ صرف پڑھے لکھے لوگوں کیلئے ایمان افروز ہے بلکہ معمولی علمیت کے مسلمان بھی اسکو سینے سے لگائیں گے اس کے علاوہ یہ خوبی تنہا اس کتاب کو حاصل ہے کہ یہ تمام اسلامی مدارس میں داخلِ نصاب ہوسکتی ہے آخر میں ان مشاہیر شعرار کا کلام بھی شامل ہے جنہوں نے دل میں اتر جانے والے اپنے آتشیں کلام سے مسلمانوں کی بیداری میں اپنی عمریں گذار دیں ہیں۔ اُن علمائے کے اسمار گرامی ملاحظہ فرمایئے جن کے بیش بہا مضامین "دینیات" میں شامل ہیں:۔

۱۔ مولانا الحاج مفتی محمد شفیع صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

۲۔ حکیم الامت علامہ شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی۔
۳۔ علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری (مصنف رحمۃ اللعالمین)
۴۔ علامہ شبلی نعمانی ۵۔ مولانا الحاج احمد علی صاحب لاہوری مفسر قرآن
۶۔ علامہ سید ابو الاعلیٰ مودودی ۷۔ مولانا محمد سلیم صاحب امراوتی برار
۸۔ علامہ محمد اعزاز علی صاحب شیخ الادب والفقہ دار العلوم دیوبند
۹۔ علامہ محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور
۱۰۔ اسوۃ الازکیا میاں صاحب سید اصغر حسین صاحب محدث دار العلوم دیوبند
۱۱۔ مولانا ظہیر احمد صاحب تاج
۱۲۔ علامہ ابو الکلام صاحب آزاد
۱۳۔ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی مفسر قرآن و شارح مسلم شریف
۱۴۔ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی ناظم تعلیمات بھوپال
۱۵۔ مولانا الحاج حبیب الرحمٰن صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد (دکن)
۱۶۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند
۱۷۔ علامہ سید جمال الدین افغانی
۱۸۔ علامہ محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند
۱۹۔ مولانا الحاج قاری سعید احمد صاحب مفتی مظاہر علوم سہارنپور
۲۰۔ علامہ محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔

صفحات ۴۰۰ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت مجلد ۴؎ بلا جلد

(لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی)
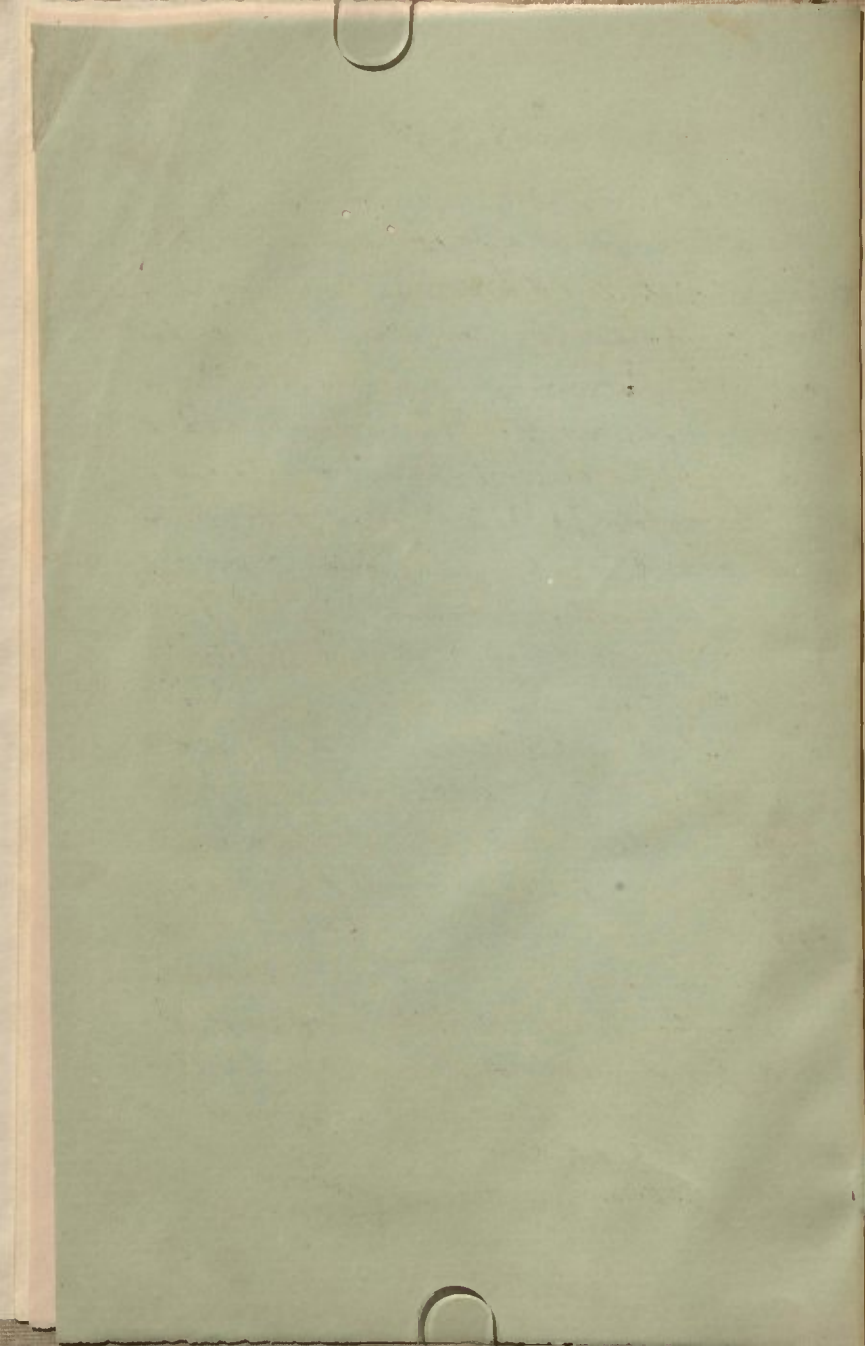
ضروری نوٹ

دہلی میں رام پور کے ایک نہایت جفاکش مستقل مزاج، صابر و عاقل اور انتہائی مخلص و ایماندار خانصاحب عبداللطیف خاں صاحب نے ایک بڑے پیمانے پر اور جدید ساز و سامان سے آراستہ برقی پریس لگا رکھا تھا جو لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی کے نام سے موسوم تھا اور جو اپنی چھپائی میں تمام چھاپہ خانوں پر سبقت لے گیا تھا اور کارکنان پریس کی اجرتوں کے معاملے میں بھی سب سے پیش پیش تھا اور اپنے مالک کی فراخ دلی کے لئے مشہور تھا اس لئے ملازم اور گاہک دونوں نہایت خوش اور مطمئن تھے۔ اس پریس کی خاطر خانصاحب موصوف نے جس قدر مصائب برداشت کئے وہ کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا تھا۔

خانصاحب نہایت خوش سیرت و خوش صورت و خوش پوش ہونے کے ساتھ ساتھ خوش معاملگی میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کے ہاں جو کام بھی چھپتا تھا وہ نہایت جاذبِ نظر ہوتا تھا۔ لطیفی پریس کو قابلِ اطمینان حالت میں لاکر انھوں نے اسی نام سے ایک پبلشنگ ہاؤس بھی قائم کیا تھا۔ لیکن ابھی یہ کام شروع ہوئے بہت تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سنہ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگامے شروع ہو گئے اور ہمارے کرم فرما اور مخلص دوست خانصاحب کو کلیجہ پر پتھر رکھ کر پاکستان جانا پڑا۔ جاتے وقت وہ چند کتابیں ہمارے سپرد کر گئے تھے بعض مکمل ہو چکی تھیں مثلاً دینیات جس کا اشتہار اس کتاب کے آخر میں ہے۔ اور بعض چھپ تو گئی تھیں لیکن سرورق وغیرہ سے آراستہ ہونا باقی تھیں چنانچہ وہ خود اگر اس کتاب کا سرورق تیار کراتے تو اسکی شان اور ہوتی اب ہم نے محض کتاب کی سترپوشی کی غرض سے اور اصل کیفیت ظاہر کرنے کے خیال سے یہ سرورق لگا دیا ہے۔ خانصاحب کے حسن مذاق اور شوق کا ثبوت اس کتاب کی کتابت و طباعت و کاغذ سے آپ آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ انکی تمام مطبوعات اسی معیار کی ہیں۔ انکی بہت سی معیاری اور بلند پایہ کتابیں جو پلیٹوں پر جمی ہوئی چھپنے کے لئے تیار تھیں ان کی ایما سے ہم نے کئی سال ہوئے علیگڑھ کے ایک پریس کے مالک منشی نذیرالدین صاحب کے سپرد کر دی تھیں جو خانصاحب کے مشیر اور ہمدرد ساتھی تھے اور جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خدا اُن کی مغفرت کرے آمین۔ (ف۔ ا)

سنگم کتاب گھر

صدر دفتر جامعہ نگر۔ نئی دہلی

کاروباری شاخ اردو بازار جامع مسجد دہلی